موسمی پرندے
انل ٹھکر

موسمی پرندے

(افسانے)

انل ٹھکر

موسمی پرندے

انل ٹھکّر

MAUSMI PARINDEY (shortStories)

By ANIL THAKKAR Rs 100/=

موسمی پرندے

(افسانے)

انل ٹھکر

ناشر۔
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
9۔گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔110002

میرا پہلا قاری

میری جیون ساتھی

میری ہم قدم، ہم سفر اور ہم ذوق

گرجا ٹھکر کے نام

کیا، کہاں؟

پیش لفظ

یہ پریم چند کی قائم کردہ افسانوی روایت ہی ہے، جسے ان کے بعد منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت اور قرۃ العین حیدر نے نئی وسعتوں اور رفعتوں سے آشنا کیا، اور یہی وہ روایت ہے، جو 1960 کے بعد جدیدیت کے دورِ عروج میں جدت کاری اور تجربہ پسندی کے غلغلے میں بھی اپنے فطری ارتقا کی سمت خاموش سفر کرتی رہی، اور آج بھی نئی قوت کے ساتھ تخلیقی شعور کے نادیدہ جہات پر حاوی ہو کر وسعت یاب ہو رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ 1960 کے بعد بعض لوگوں نے افسانے میں تجربہ کاری کی دھن میں ایسے علامتی اور تجریدی افسانے لکھے جو روایت کے بجائے بغاوت اور فنی برجستگی کے بجائے دماغی کاوش کے مظہر تھے، ایسے افسانے یا تو کہانی پن کے اخراج یا من مانے طور پر قائم کردہ ابہام و اشکال کے غیر ادبی رویے کو بے نقاب کرتے رہے، اور بجا طور پر اپنی معمائیت سے قاری کی پریشانی کا موجب بن گئے، اور افسانہ Readability کی صفت سے محروم ہو گیا، تاہم یہ افسانے کی کلی صورتِ حال نہ تھی، اس دور میں ایسے علامتی افسانے بھی لکھے گئے، جو کہانی پن کے ساتھ ساتھ فطری طور پر وارد ہونے والے ابہام کے حسن سے متصف تھے، اور ایسے فن شناس افسانہ نگار بھی موجود تھے جو مروجہ فیشن کے بہکاوے میں نہ آکر پریم چند کے "کفن" کی روایت کی توسیع کرتے ہوئے افسانے

کی فنی سالمیت کی ثابت قدمی سے پاسداری کرتے رہے۔ ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں انل ٹھکر نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

انل ٹھکر ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے کہانی پن کی زندہ مثال ہیں۔ وہ افسانے پر کہانی کو طاری کرنے کے لیے کدو کاوش نہیں کرتے بلکہ غیر معمولی خلاقی سے افسانہ کی خلقی افسانویت کو دریافت کرنے کے عمل کو روا رکھتے ہیں۔ دریافت کے اس اکتشافی عمل میں وہ ایک مصنف کی حیثیت سے پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ اور افسانہ خود اپنی افسانویت کی یافت اور تحفظ کرتے ہوئے اپنے کلی وجود کا اثبات کرتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو افسانے کو افسوں بناتا ہے اور قاری غیر ارادی طور پر اس کے حاوی اثر کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ اس نکتے کی قدرے تفصیل بیان کی جائے۔ تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انل ٹھکر افسانہ نگار کی حیثیت سے افسانے پر حاوی ہوتے ہیں نہ اس میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ افسانہ ان کی تخلیقی شخصیت، جو ثقافتی، علاقائی اور اساطیری عناصر کا مرکب ہے۔ سے اس کے تمام تر آب و رنگ کی کشید کرکے۔ اپنے فنی لوازم کا احترام کرتے ہوئے۔ اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اور ایک زندہ، خودکفیل اور حرکی وجود کی طرح دھڑکتا ہے، پھیلتا ہے۔ اور آس پاس کی فضا کو مرتعش اور منور کرتا ہے۔ "معجزہ"۔ "ہزاروں خواہش ایسی "۔ "موسمی پرندے" اور "آرائش" اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ "معجزہ" میں واحد متکلم ایک ایسا کردار ہے۔ جو مرنے کے بعد ہنڈیا میں راکھ کی صورت میں، جسے اس کا بیٹا گنگا میں بہانے کے لیے لاتا ہے۔ اپنی زندگی کے بیتے واقعات کو یاد کرتا ہے۔ وہ بچپن میں جب ماں باپ کے ساتھ دھرم شالہ پہنچتا ہے۔ تو گنگا کے تیز بہاؤ اور بندروں کی ٹولیوں سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ بندر اور بندریا کے جنسی عمل کو دیکھ کر اولین جنسی بیداری کے مبہم تجربے سے گذرتا ہے۔ تین چار سال کے بعد وہ پھر وہاں آتا ہے۔ اور ایک کم سن لڑکی کو پانی میں نہاتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے جسم کے نشیب و فراز کو دیکھ کر اس کے

کانوں کی لویں گرم ہوجاتی ہیں اور پھر فسادات کی زد میں آئی ہوئی مادر زاد برہنہ لڑکیوں کی تصویریں دیکھتا ہے۔ اس صدمے کے زیرِاثر وہ اس کے بعد صنفِ نازک کے کسی پیکر کی جانب راغب نہیں ہوتا اور جب اس کی شادی ہوجاتی ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نچلا دھڑ بے حس ہوچکا ہے۔ وہ بیٹے کی حسرت لیے اور اس سے بھی زیادہ بیٹے کے ہاتھوں اپنی استھیاں گنگا میں بہانے پر جنّت میں جانے کی آرزو اسے ایک سوامی جی کے پاس پہنچادیتی ہے۔ جو اسے تیس دِنوں کے لیے بدری ناتھ جانے کو کہتا ہے اور اس کی پتنی کو اپنے آشرم میں پوجا کے لیے بیٹھنے کو کہتا ہے واپسی پر وہ سوامی جی سے رخصت ہونے پر بیوی کے جسم کی کشش سے مغلوب ہوجاتا ہے۔ اور اس کے جسم کے بے جان حصے میں حرکت ہوتی ہے۔ سٹیشن پر وہ ایک دن کے لیے کسی ہوٹل یا دھرم شالے میں رہ کر جنسی تسکین حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے کہ پاس ہی اس کی بیوی نل پر قے کرتی ہے۔ اس طرح سے افسانے کے حوالے سے ایک طربیہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے اور افسانہ کردار کے وجودی کرب کی تمثیل بن جاتا ہے یہ وجودی کرب جبلّی جذبے کی بیداری اور پھر سماجی اور سیاسی سفّاکیت کے دباؤ تلے اس کے لیے ایک مستقل عذاب بن جاتا ہے۔

"ہزاروں خواہشیں ایسی" میں مرکزی کردار ہسپتال میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی شریکِ حیات ہے اور دکھ سکھ کا ساتھی دوست۔ اسے ماضی کے واقعات یاد آتے ہیں۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ سرد و گرمِ زمانہ چکھنے اور مفلسی کا مقابلہ کرنے کے بعد دنیوی کامرانی کی منزل طے کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ نئی کوٹھی میں اس کی بہو پہلا قدم رکھے۔ اتنے میں اس کا بیٹا آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بہو کو بلایا جائے اور اس کے سامنے اس کی شادی ہوجائے۔ پتنی اور بیٹا اس کی آرزو کو نظر انداز کرکے اصرار کرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کے نام اور رقم بتائیں، جن سے وہ وصول کریں گے۔ اور وہ مایوس ہوکر آخری ہچکی

لے لیتا ہے۔ افسانے میں موت کی کرب انگیز ناگزیریت اور رشتوں کی بے معنویت کے علاوہ انسان کی ناتمام آرزوؤں کا دکھ پوری شدت سے ابھرتا ہے۔ "آرائش" میں کنواری لڑکی کا کردار ہے۔ جو اپنی انا کا احساس کرتی ہے۔ اور اسے اپنے باپ کی انا سے قطعی مختلف قرار دیتی ہے۔ اور اس کی تحفظیت کے لیے مترّدد ہوتی ہے۔ باپ جس گھر کے لڑکے سے اس کی منگنی کرتا ہے وہ اس کے قریب ہو جاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیتی ہے۔ مگر یہ سن کر کہ لڑکے والے نے کم جہیز دینے کی شکایت کی ہے۔ باپ طیش میں آکر منگنی توڑتا ہے۔ ادھر لڑکی ناک کے کیل کا ہیرا، جو اسے دادی نے دیا تھا اور جو اس کے چہرے کو روشن کرتا ہے۔ منگیتر سے واپس لینے کے لیے نکلتی ہے کہ باپ اعلان کرتا ہے کہ اسے دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ اور وہ ڈھ جاتی ہے۔ افسانے میں ایک جوان لڑکی کے جوانی کے احساسات اور خوابوں کی مصوری واقعات کی تسلسل کے سیاق میں کی گئی ہے۔ اور پورے افسانے میں قاری لڑکی کے جذبات اور ذہنی سفر میں مکمل طور پر شریک ہوتا ہے۔ اور اس کی کچلی ہوئی انانیت کے المیے کو محسوس کرتا ہے۔

انل ٹھکّر سماجی حالات کی نابرابری کے نتیجے میں انسانوں کے المناک اور روح فرسا حالات و مقدّرات کے افسانہ خواں ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ افسانے کی دنیا میں وارد ہو کر قاری ان کے خلق کردہ کردار کے ساتھ مختلف وقوعات سے گذرتا ہے۔ اور جب افسانہ تمام ہوتا ہے۔ تو کرداروں کی ہزیمتوں، ناداریوں اور ہلاکتوں کا تاثر برقرار رہتا ہے۔ افسانہ نگار جذبات کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ ضبط و تحمل سے کرداروں کے اندرون میں ہونے والے کہرام کا مشاہدہ کرتا ہے۔

ان کی کامیابی کا راز افسانوی ٹیکنیک کے بنیادی عناصر کے موثر برتاؤ میں مضمر ہے۔ وہ خاص طور پر دو باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ اول۔ افسانے کی بُنت میں قصّہ پن کو اوّلین اہمیت دی جائے اور اسے بیانیہ سے زیادہ واقعات کی بوقلمونی

سے استوار کیا جائے۔ کوئی بھی افسانہ لیجیے۔ اس میں بیانیہ سے کم اور پے در پے واقعات سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ جس سے افسانے کا ایک مخصوص پیٹرن وجود میں آتا ہے۔ جو معانی کی تہہ داریت کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ایسے کرتے ہوئے انہیں علامتوں کی تلاش میں بھٹکنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ افسانے کے نو بہ نو واقعات اپنے تسلسل اور تواتر سے افسانے کے خود مکتفی وجود کی تکمیل کرتے ہیں اور افسانہ معنوی اعتبار سے برومند ہوجاتا ہے۔ دوم۔ وہ کسی طے کردہ موضوع کی شعوری تشکیل کے بجائے تخیلی سطح پر کردار و واقعہ کی آویزش کی تخلیق میں منہمک ہوجاتے ہیں اور ان کے باہمی تعمل سے ایک افسانوی ماحول کو ابھارتے ہیں۔ یہ ماحول کسی خارجی۔ ہنگامی یا مانوس ماحول کی خارجی تصویر نہیں۔ بلکہ داخلی۔ آب و رنگ سے آمیز ہوکر ایک منفرد حقیقت بن جاتا ہے۔ اور فنی جواز سے ایک دائمی قدر۔ کا رتبہ حاصل کرتا ہے۔ اس طرح سے افسانے کا کردار انسان کے ازلی اور جبلی مقتضیات کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ "تنہا شاہ سوار" میں مرکزی کردار شاعر ہے۔ جو اردو زبان۔ جو اس کا وسیلہ۔ اظہار ہے۔ کی زوال آمادگی سے اداس ہے۔ اس کے گھر والے اس کے شعری کارناموں کے عوض اس کے ایوارڈ پانے کی خوشی میں شریک نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ اردو سے نابلد ہیں۔ تاہم اس کا شریر پوتا اس کی سند پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچتا ہے اور کہتا ہے کہ 'وہ اردو لکھ رہا ہے۔ یہ سن کر وہ اسے گلے لگاتا ہے اور خوش ہوجاتا ہے۔ "معجزہ" میں جنسی جبلت "ہزاروں خواہشیں ایسی" میں ناآسودہ خواہشیں اور قریب المرگی۔ "کریلا نیم چڑھا" میں بے وطنی کا درد "گونگی چیخ" میں معصوم انسانوں کا استحصال۔ "آرائش" میں لڑکیوں کی مجروح انانیت اور "سانسیں اپنی قبروں میں" میں جھگی جھونپڑی میں رہنے والی ماں بیٹی کی حیوانوں سے بدتر زندگی کا کرب۔ جھلکتا ہے۔

مصنف سماج کے مختلف طبقوں' خاص کر نچلے طبقے کی زندگی کے درد و داغ کا پوری باریک بینی اور ہمدردی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ فضا آفرینی کے

لیے طول طویل بیانیہ یا منظر نگاری سے کام نہیں لیتے، بلکہ اشارے کنایے سے پورے ماحول کی تصویر کھینچتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ لفظوں کے ظاہری معانی کے ساتھ ساتھ انسلاکاتی امکانات کو بھی بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ افسانے کی صورتِ حال کے سیاق میں کم سے کم الفاظ میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ "ننھا شہسوار" میں شاعر کا کردار یہ سوچ کر اداس ہو جاتا ہے کہ اس کی زبان کو سمجھنے والا کوئی نہیں اور جب اس کا پوتا اس کی سند پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر کہتا ہے کہ وہ اردو لکھ رہا ہے تو وہ خوش ہو کر اسے گلے لگاتا ہے۔ اور افسانہ چار لفظوں پر مشتمل سطر پر ختم ہوتا ہے ـــــ اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔

آنکھوں کی نمی اگر خوشی کی وجہ سے ہے تو ایک گہری طنزیہ صورتِ حال خلق ہوتی ہے کیونکہ پوتے کے اس کی سند پر لکیریں کھینچنے کا یہ مطلب نہیں کہ نئی پیڑھی اردو زبان سیکھنے پر آمادہ ہے۔ جبکہ اس کے ماں باپ زبان سے بیگانۂ محض ہیں۔ آنکھوں کی نمی اس مستقل مایوسی کا اشاریہ بھی ہے۔ جو زبان کی موت کی پیدا کردہ ہے۔ یہ نمی اس احساسِ محرومی کی غماز بھی ہے جو انفرادی دکھ کی علامت ہے۔ اسی طرح "معجزہ" کے آخری دو جملے یہ ہیں:

"تیز قدموں سے پتنی کے قریب پہنچا دیکھا ـــــ وہ قے کر رہی ہے"

افسانے کی صورتِ حال اور اس کے عنوان "معجزہ" کے سیاق میں یہ مختصر سے جملے ایک متناقضی کیفیتِ ذہنیہ کو جنم دیتے ہیں۔ تیز قدموں سے پتنی کے قریب پہنچنا اور یہ دیکھنا کہ وہ قے کر رہی تھی۔ کردار کے متناقضانہ روّیے پر دلالت کرتا ہے۔ بیوی کا قے کرنا۔ سوامی جی کا معجزہ بھی ہے۔ جسے کردار صاد کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی معجزے کی تضحیک بھی ہے۔ جو کردار کے تمام عمر خاموشی سے بھوگنے کے کربناک عمل سے مربوط ہے۔ اس کے علاوہ مکالموں کی فطری روانی، مقامیت کی خوشبو۔ واقعات کے تیز بہاؤ اور زبان کی اختصاریت سے ان کے افسانوں کی تاثیر دوچند ہو جاتی ہے۔

ـــــــ حامدی کاشمیری

مقدّمہ

کہانیاں لکھنا خواب اور حقیقت کے درمیان سفر کرنا ہے۔ ہر ادیب کی تخلیقات میں ان کی آمیزش کا تناسب مختلف ہوتا ہے۔ کسی میں اس کی شخصیت اور مزاج کے اعتبار سے خواب کی کارفرمائی زیادہ ہوتی ہے کہیں حقیقت تخیّل کی باگ تھامے رہتی ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان کی گذشتہ پچاس سال کی تاریخ بھی خواب سے حقیقت کا سفر ہے۔ آزادی کے وقت ہم نے ہر طرح کے تعصّبات سے پاک مساوات اور اخوّت اور آزادی کے علم بردار ایک سماج کا خواب دیکھا تھا۔ آج کا ہندوستان شکستِ خواب کا منظر پیش کر رہا ہے۔ انِل ٹھکّر کے افسانے اس منظر کو پیش کرتے ہیں۔ جن حقائق سے ہم آنکھیں چرانا چاہتے ہیں وہ انھیں اپنی تمام تر تلخی اور بھیانک پن کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً افسانہ "ننھے شہسوار" کا ادیب، جس نے معاشی آسودگی کی خاطر اپنے بچّوں کو انگریزی اسکولوں میں پڑھایا، آج وہ آزردہ ہے کہ اس کی ادبی کامیابی میں اس کے بچے شریک ہونے سے قاصر ہیں کیونکہ وہ اس کی تخلیقی سرگرمی کی اہمیت کی زبان سے ناواقفیت کے باوصف اندازہ لگانے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح افسانہ "موسمی پرندے" کا مرکزی کردار ایک ایسا شخص ہے جس کا لڑکا روزگار کی خاطر امریکہ بس گیا ہے۔ برسوں بعد بیٹا اپنے بچوں کے ساتھ ہندوستان آیا ہے اور وہ اپنے پوتوں کو دیکھ کر نہال ہو رہا ہے لیکن انھیں چھوتے

پیار کرتے ڈرتا ہے کہ وہ ایک اجنبی تہذیب کے سائے میں پل رہے ہیں۔ اُس کے پیار سے کہیں انھیں وحشت نہ ہو۔ "معجزہ" مذہبی جنون و تشدد اور بے راہ روی کا آئینہ ہے جس نے ہمارے سماج کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس افسانے میں بندر وحشت و تخریب کا استعارہ بھی ہیں اور فطرت کے اصولِ تخلیق کا بھی جس میں لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی ـــــ "آرائش" میں یہی اصولِ تخلیق ایک بالکل نئے اور نازک زاویے سے بیان ہُوا ہے۔ افسانے "گونگی چیخ" اور "ما بھی نریندر مرا نہیں" آج کے سیاسی ماحول کی تلخ سچائیوں کا اظہار ہے اور انل ٹھکر کے فنی قابو کا شاہد ہے۔

انل ٹھکر جانے مانے ڈرامہ نگار اور ادیب ہیں۔ ان کے ڈراموں کے دو مجموعے اور افسانوں کا ایک مجموعہ "گرم برف" اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ہندی میں بھی لکھتے ہیں لیکن اردو ان کا پہلا عشق ہے۔ آج کے ادیبوں کے متعلق یہ شکایت عام ہے کہ ان کے تخلیقی سوتے جلد خشک ہو جاتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اُنل ٹھکر جیسے ادیب ہمارے درمیان ہیں وہ ڈرامہ نویس بھی ہیں اور اداکار و ہدایت کار بھی۔ یہ تخلیقی وفور قابلِ رشک ہے۔

افسانوں کا یہ مجموعہ آج کی نسل کا نمائندہ مجموعہ ہے جو سچائیوں سے آنکھیں چرانا پسند نہیں کرتی۔ نہ ہی منافقت اور ریاکاری کی قایل ہے۔ تلخ حقیقتوں کو زبان و بیان کا ملمع چڑھا کر قابلِ قبول بنانا بھی اسے گوارا نہیں۔ وہ ہماری اس حقیقت پسند روایت کے امین ہیں جو 1930 کے بعد ہندوستانی زبانوں میں حاوی رجحان قرار پایا۔ جسے اردو میں پریم چند، بیدی، عصمت چغتائی، منٹو، رام لعل اور غیاث احمد گدی جیسے افسانہ نگاروں نے بڑی عمدگی سے برتا ہے۔ اب انل ٹھکر اسے نئے تخلیقی زاویوں اور آج کی عصری حسیت کے ساتھ بڑی کامیابی اور ہنرمندی سے پیش کر رہے ہیں۔ اس مجموعے کا مطالعہ گذشتہ پچاس سال کے ہندوستان کا تہذیبی اور معنی خیز اظہار ہے۔ جس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

ـــــــــ انور خاں

ننھّا شہسوار

Congrats Dad

ہیں!!

اس کے ہونٹوں اور کپ کا درمیانی فاصلہ سمٹ کر رہ گیا۔ نچلا ہونٹ یوں لرزا جیسے کپ کے لمس کو ترس گیا ہو۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا، سامنے اس کا بڑا بیٹا ٹائی کی ناٹ (Knot) ٹھیک کرتے ہوئے کھڑا تھا

سنا ہے You have got some award

اوہ ــــ ہاں ہاں ــــ

اس نے بے دلی سے جواب دے کر چائے کی چسکی لی اور پوچھا ــــ

تم سے کس نے کہا؟

your friend,retired judge Mr.kapoor. کل کلب میں مل گئے تھے

He told me

وہ اداس ہو گیا۔

اس نے دوسری طرف دیکھا۔ بغل میں چھوٹا بیٹا تیزی سے ٹوسٹ کھاتے ہوئے چائے پی رہا تھا۔ تاکہ دفتر پہنچنے میں دیر نہ ہو جائے۔ میز پر سامنے اخبار پڑا ہوا تھا، چائے کے گرم گھونٹ اور تازہ گرم گرم خبروں کا چٹ پٹا پن، ایک ساتھ

اس کے سینے میں اتر رہے تھے۔

اس نے اپنا چائے کا کپ لیا۔ آہستہ روی سے بالکنی میں آگیا۔ ایوارڈ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھے۔ اس سے پہلے بھی اس نے ایوارڈ حاصل کیے تھے۔ وہ اپنی زبان کا صفحہ اوّل کا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ محفلِ مشاعرہ یا ادبی انجمنوں میں اس کی موجودگی جلسوں کی شان۔ ان کی کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی تھی۔

دسویں منزل پر اپنے فلیٹ کی بالکنی سے اس نے دور افق پر نظریں جمائیں۔ جہاں گھنی آبادی کے بیچ زمین سے اٹھ کر آسمان کو چھوتی ہوئی قطب کی لاٹ اسے نظر آئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے کھلی کتاب کے پنّوں پر جملوں کے بیچ علامتِ استعجابیہ کھڑی ہو!

اس کے ذہن کے پنّوں پر بھی ایسی ہی علامتیں ابھرنے لگیں۔ اس نے سوچا۔ تو اُسے تعجب ہوا کہ ــــ جب جب اسے ایوارڈ۔ یا اعزاز ملا۔ وہ اداس ہوگیا۔ اداسی کُہرے کی صورت دنوں اس کے ذہن پر چھائی رہتی۔ پچھلے چار پانچ روز سے وہ اداس ہے آج اداسی کچھ چھٹ سی رہی تھی کہ بیٹے کی بات نے کہرے کو گہرا کر دیا۔ قطب سے نظریں ہٹائیں۔ کپ ہونٹوں سے لگایا اور چائے کی چسکی لی۔ ہتھیلی پر بچی ہوئی بھاگیہ ریکھا کی طرح نیچے دُور تک پھیلی سڑک پر سردیوں کی ہلکی ہلکی دھوپ میں پیٹھ پر بستے لادے بچے اسکول جا رہے تھے۔

چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس نے بچوں کو دیکھا، تو اسے گرما کی چھٹیوں میں بوجھ سے لدے پہاڑی قلی یاد آگئے۔ اس نے سوچا، قلیوں کی کمر کو تو گردشِ دوراں نے دُہرا کر دیا تھا۔ مگر ان بچوں کو کس گردش نے دبوچا ہے کہ ان کا بچپن کتابوں کے بوجھ سے جھکا جا رہا ہے!

اس نے کپکپی سی محسوس کی۔ وہ پلٹا۔

مما، میں چلتا ہوں۔

چھوٹے بیٹے نے دورازہ کھولا اور دفتر جانے کے لیے تیزی سے باہر نکل گیا۔

وقت کے وہ ثانیے جو دروازہ بند کرنے کے لیے درکار تھے، اس کے پاس موجود نہیں تھے۔

چائے کا خالی کپ کھانے کی میز پر رکھنے کے لیے وہ اداس قدموں سے آگے بڑھا ہی تھا کہ اس کی خواب گاہ کا دروازہ کھلا۔ خوشبو کی لہر پورے گھر میں پھیل گئی۔ اس کی پتنی نمودار ہوئی۔ ماں کو دیکھ کر بڑا لڑکا چائے کا آخری گھونٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پتنی نے بہو کی جانب دیکھا۔

دھوبی آئے تو اسے پے مینٹ کر دینا۔ پیسے الماری میں رکھے ہیں۔ دو قدم چل کر وہ رکی، پتی سے کہا ــــــ

آپ کو یاد ہے نا، آج وید پرکاش جی کے یہاں رِسیپشن میں جانا ہے۔

جواب کا انتظار کیے بغیر ہی وہ چل پڑی۔ بڑا بیٹا دروازہ بند کرتے ہوئے، اس کے پیچھے ہو لیا۔

اس کی پتنی کالج میں لیکچرار تھی۔ بڑا بیٹا سرکاری دفتر میں افسر تھا۔ اس کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ ہر روز ماں کو کالج چھوڑ کر وہ اپنے کام پر جاتا تھا۔

ویسے تو وہ بھی ایک کمپنی میں بڑا افسر رہا ہے۔ پانچ سال پہلے رضا کارانہ طور پر ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنی روحانی خوشی کے لیے ادب کی خدمت میں جٹ گیا تھا۔

بہو نے سُسر کو یوں ہاتھ میں کپ تھامے، سوچ میں ڈوبا دیکھا تو پوچھا۔

پاپا جی! آپ تھوڑی چائے لیں گے؟

ہوں ــــــ

چونک کر اس نے بہو کی جانب دیکھا، ہاتھ قدرے آگے بڑھایا، بہو نے کیتلی اٹھائی اور چائے کپ میں انڈیلنے لگی۔

پاپا جی ــــــ ایک بات پوچھوں؟

پوچھو۔

ایوارڈ ملنے سے آپ خوش نہیں ہیں؟

خوش ـــــــ ہوں۔

پھر آپ اس خوشی کو سب کے ساتھ بانٹتے کیوں نہیں؟

کیونکہ میری خوشی کے ساتھ اداسی بھی جڑی ہوئی ہے۔ جڑواں بچوں کی طرح۔ وہ بالکنی کی طرف مڑا۔ بہو مسکراتے ہوئے رسوئی گھر کی جانب یہ سوچ کر پلٹی کہ سُسر کے ذہن میں کوئی نظم جنم لے رہی ہے۔

اُس کے ذہن میں نظم جنم نہیں لے رہی تھی۔ ایک خیال، ایک سوچ نے جنم لیا ـــــــ میں اپنی خوشی کو کیوں بانٹ نہیں پاتا!!

اس نے سوچا ـــــــ بانٹنے سے خوشی دگنی ہو جاتی ہے۔ مگر کس کے ساتھ بانٹوں میں اپنی خوشی؟

سچ مچ خوشی کو بانٹ کر دونی کرنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ بانٹ کر ہلکا کرنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔

بالکنی میں سے بچوں کو اسکول جاتے ہوئے دیکھا تو اسے اپنا بچپن یاد آگیا ـــــــ وہ بھی کیا دن تھے۔

پتاجی کپڑے کی مل میں بابو تھے۔ مل شہر سے ہٹ کر بنائی گئی تھی۔ رہائشی کوارٹرس بھی وہیں تھے۔ مل اور شہر کے درمیان ایک لمبا چوڑا میدان تھا۔ جس میں سرکنڈے سر اٹھائے رہتے۔ وہ اپنے دو چار ساتھیوں کے ہمراہ ان سرکنڈوں کے بیچ گذرتی ہوئی پگڈنڈی پر سے روزانہ اسکول جاتا۔ بستے کے نام پر کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی، جس میں ایک کتاب، دو ایک برو کے قلم، سفید یا پیلی کھڑیا کا ایک آدھ ٹکڑا، ایک تختی اور روشنائی کی چھوٹی سی شیشی۔

وہ تختی کے ہتھے میں تھیلی کے دستوں کو اٹکا کر انھیں اپنے کندھے پر دو حصوں میں بانٹ لیتا۔ تختی پیٹھ پر تھیلی سینے پر اور روشنائی کی شیشی کی گردن میں بندھی رسی ہاتھ میں۔ شیشی ہاتھ میں لٹکتی رہتی۔ جیسے شکاری کے ہاتھ میں شکار کی

ہوئی مرغابی۔

اسکول سے گھر لوٹے نہیں کہ بستہ پھینکا ایک طرف اور آ گئے گلی میں۔ ہاکی اور گیند لے کر، یا گلی ڈنڈا لے کر۔ یہ بھی نہیں تو پھر کبڈی، کبڈی، کبڈی تو تھی ہی

ہوم ورک کے نام پر شاید ہی کچھ کرنے کو ہوتا جو بھی سیکھنا ہوتا، منشی ترلوکی ناتھ، اسکول میں ہی ڈنڈے کے زور پر سکھاتے تھے۔ بھولا ہوا سبق یاد کرانے کو گھٹنوں مرغا بنا کر کھڑا کر دیتے۔ دو دونی چار، چار دونی آٹھ کے پہاڑے، ہاتھ میں بیت کی چھڑی لے کر ایسے رٹاتے جیسے کوئی موسیقار کسی دھن کا ریاض کروا رہا ہو۔

چائے کی تازہ چسکی کے ساتھ اسے یاد آیا___ جب اس کے بچے، نچلی جماعت میں پڑھتے تھے، تب انھیں کتنا ہوم ورک کرنے کو ملتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اور اس کی پتنی ان کا ہوم ورک لیتے لیتے تھک جاتے مگر ہوم ورک ختم ہوتا نظر نہ آتا۔ پھر بھلا وہ بچے گلی محلے میں کیا کھیلتے!! ان کے پاؤں گلی کی دھول میں کبھی میلے نہیں ہوئے، ان کے بالوں میں گرد کی پرتیں نہیں جمیں۔ یہ تو وہ پودے ہیں، جنھیں اپنی دھرتی سے اکھاڑ کر پرائی دھرتی پر بویا گیا ہے۔ ان میں اپنی دھرتی کی مہک کیسے آئے گی، ان میں اپنی تہذیب کے کنول کیسے کھلیں گے!!

اس نے دیکھا، کچھ لیٹ لطیف قسم کے بچے گپ شپ کرتے ہوئے اب بھی اسکول جا رہے تھے۔

شوخ رنگ، صاف ستھرے، کسے ہوئے یونیفارم کو دیکھ کر اس نے آہ بھری!___ پہلی بارش کے بعد اٹھنے والی بھاپ کی نمی کو اس نے اپنے سینے میں محسوس کیا۔

اپنے زمانے میں تو کوئی رنگین یونیفارم نہیں ہوا کرتا تھا۔ کپڑوں کا ایک ہی رنگ تھا، مٹ میلا۔ دھرتی کا رنگ۔

اس کے جسم سے بچپن کے کپڑوں کی بو ہلکے ہلکے اٹھنے لگی۔ جیسے اگر بتی کا دھواں، بل کھاتے ہوئے۔ دھیرے دھیرے اٹھتا ہے۔

وہ من ہی من میں بد بدایا ـــــ ہمارے زمانے میں تو مدرسے کے لیے علیحدہ سے کوئی لباس نہیں ہوا کرتا تھا۔ صبح پہنے ہوئے کپڑے دوسری صبح تک یا پھر دو تین روز تک جسم سے چپکے رہتے۔ ہاں، موسم کے مزاج کے ساتھ کپڑے بدل جایا کرتے تھے۔ گرما میں نیکر اور قمیض۔ جاڑے میں پاجامہ، سویٹر اور کوٹ۔ سویٹر اور کوٹ تو موسم بھر جونک کی طرح جسم سے چپکے رہتے۔ گرد و غبار سے لت پت۔

کپڑوں کے بدلتے ہی ان سے اٹھنے والی بو بھی بدل جاتی۔ خصوصاً جاڑوں میں بدن سے اٹھنے والی بو سے اسے بہت چڑ تھی۔ جاڑوں میں ماں نہلانے سے پہلے سرسوں کا تیل جسم پر ملتی، تو سارا جسم چٹ چٹ کرنے لگتا۔ جیسے کسی نے تیل کی گرم کڑھائی میں نمک کی ڈلیاں ڈال دی ہوں۔ نہانے کے بعد بھی جلن ہوتی رہتی۔ اور سرسوں کی بو تو جاڑوں کے بعد بھی باقی رہ جاتی۔ آج بھی جب اسے اپنے جسم سے اس بو کا احساس ہوتا ہے تو ابکائی سی آنے لگتی ہے۔

سچ مچ اسے اس بو سے بہت چڑ تھی، مگر کیا کرتا۔ ماں کو سرسوں کا تیل ملنے نہ دیتا تو سردی سے چمڑی پھٹنے لگتی۔ اس سے خون رسنے لگتا۔ جو اس بو سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا۔

رفتہ رفتہ وہ بو مسامات میں اتر کر اس کے وجود کا حصہ بن گئی۔

سرد ہوا کا جھونکا اس کے چہرے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ جھونکے کے سرد لمس نے اس کو چونکا دیا۔ اس نے اپنے گال کو چھوا تو اس پر چکناہٹ سی محسوس کی۔ اس چکناہٹ کو اس نے سونگھا، وہ مسکرا دیا۔

وہ مسکرایا، کیونکہ اس چکناہٹ میں لجلجا پن نہیں تھا۔ اس میں سرسوں کی بو نہیں تھی، اس میں کریم اور لوشن کی خوشبو مہک رہی تھی ـــ اس نے اپنی

پہچان کی بو کو بھلا دیا تھا۔

ملک کے بٹوارے کے بعد جب وہ دہلی آیا۔ تو ان دنوں دہلی میں اونچے طبقے میں ایک متعدی مرض پھیلا ہوا تھا۔

مرض تو آخر مرض ہوتا ہے۔ وہ طبقہ نہیں دیکھتا۔ ذات پات نہیں دیکھتا۔ امیر غریب نہیں دیکھتا۔ عورت مرد نہیں دیکھتا۔ وہ تو پھیلتا ہے اور پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔

اس مرض نے اسے بھی دبوچ لیا۔

مرض کا شکار بنتے ہی۔ اس کا رنگ ڈھنگ بدل گیا۔ رنگ نظروں کا بدلا اور ڈھنگ سوچ کا۔ اس نے اپنے بیٹے کے لیے مٹ میلے دھرتی کے رنگ والے کپڑے کی جگہ۔ شوخ رنگ کا کسا ہوا یونیفارم پسند کیا۔ اپنی مادری زبان کے مدرسے میں بھرتی کرانے کے بجائے اسے انگریزی اسکول میں داخلہ دلوا دیا۔

دفعتاً اس کے دل کو دھکا لگا۔ اس نے سوچا۔۔۔ یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے۔ آج وہ اگر میری زبان۔ میری شاعری۔ میرے ایوارڈ اور اعزاز میں دلچسپی نہیں لیتے تو ان کا کیا قصور ہے؟ ببول بو کر آم کی امید کیا معنی!!

اس نے سوچا۔۔۔۔۔ اس نے اپنی مادری زبان سے غداری کی ہے۔

اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ لڑکھڑایا۔ اس نے محسوس کیا۔ وہ غش کھا کر دسویں منزل سے گر پڑے گا۔ وہ خوف زدہ ہو کر اندر کو گھوما۔ اتفاقاً سامنے سے اس کی بہو مسکراتی ہوئی آئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے چائے کا خالی کپ اس سے لیا۔

پاپا جی۔ آپ کے لاڈلے پوتے کی آواز بہت دیر سے نہیں آئی۔ ذرا دیکھیے تو سہی۔ وہ آپ کے کمرے میں کیا کر رہا ہے؟ وہ گھبرا گیا۔ وہ اپنے لکھنے کا سارا سامان۔ چار روز پہلے ملنے والے ایوارڈ کی سند کا کاغذ وغیرہ سب کچھ ویسے ہی ٹیبل پر چھوڑ کر چائے پینے آیا تھا۔ پوتا بڑا شریر ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اس نے سند کا کاغذ چار روز سے ٹیبل پر یہ سوچ کر کھلا چھوڑ رکھا تھا کہ گھر

میں کوئی تو اسے دیکھے، اسے اٹھائے، اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر کچھ کہے۔ مگر اب یہ شریر بچہ..........

وہ تیز قدموں سے اپنے کمرے کی جانب لپکا، اندر کا نظارہ دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

نبیل کا سارا سامان تتر بتر ہو چکا تھا۔ کچھ کاغذ فرش پر بکھرے پڑے تھے، اس کا پوتا ایک پاؤں موڑے، دوسرا پسارے، اس کا قلم لیے سند کے کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے میں مشغول تھا۔

وہ پاگلوں کی طرح چلایا.......... یہ کیا کر رہے ہو بنٹو؟

بنٹو نے لکیریں کھینچنے کی رفتار بڑھاتے ہوئے اسے یوں دیکھا، جیسے اس نے قابلِ تعریف کام کیا ہو۔

وہ مارے غصے کے کانپنے لگا۔

بنٹو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولا______ دادا جی، میں اردو لکھ رہا ہوں۔

بنٹو نے ٹیڑھی میڑھی لکیروں سے بھرا سند کا کاغذ اس کی جانب بڑھایا۔

اس نے سند کی پروا نہ کرتے ہوئے پوتے کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ بنٹو نے اپنی چھوٹی چھوٹی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں، اس کا گلا بھر آیا۔ وہ دھیمی آواز میں بولا______ واہ رے میرے یار، میرے ننھے شہ سوار۔

اس کی آنکھیں نم تھیں.......

OO

معجزہ

وقت کس قدر جلدی گذر جاتا ہے!

———پتہ نہیں چلتا

پلک جھپکتے ہی بیس دِن گذر گئے۔

ان بیس دنوں میں نہ جانے کتنے لوگوں نے مجھے بھُلا دیا ہوگا۔ کتنوں ہی نے سرد گرم آہیں بھری ہوں گی اور میری یاد کو ہواؤں میں تحلیل کر دیا ہوگا، کچھ ایسے بھی ہوں گے، جن کی نم پلکوں پر رُکے رُکے سے اشکوں میں میرا چہرہ یوں ابھرا ہوگا، جیسے جوان چاند کی سطح پر چرخہ چلاتی ہوئی بڑھیا کا نقش ابھرتا ہے۔

میں نے بھی عمر بھر سانسوں کا چرخہ چلایا، اور آج اس کا کل حاصل——

ایک چھوٹی سی ہنڈیا میں سمیٹ کر پانی میں بہانے میرا بیٹا گنگا کے کنارے لے آیا ہے۔

مجھے نہیں معلوم——آریہ قوم کے لوگوں نے کب پہلی بار گنگا کے کنارے ڈیرا ڈالا تھا۔ یہ بھی نہیں جانتا کتنے سو سال پہلے ترکوں اور مغلوں کے گھوڑوں نے آبِ گنگا سے اپنے تھکے ہارے جسموں کو تر و تازہ کیا تھا۔

ہاں، یہ ضرور یاد ہے——میں اس کے کنارے پہلی بار کب پہنچا۔

اس کے کنارے پہنچتے ہی دو چیزوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ ایک اس کے پانی کی تیز دھارا، دوسرے، اس کے کنارے آباد بندروں کی ٹولیاں۔

دھرم شالے میں پہنچتے ہی میرے ماں باپ نے میرے بھائی اور رسوئیے کے ساتھ مل کر اسبابِ سفر کو دو کمروں میں رکھنا شروع کیا۔ میں ان سے نظریں بچا کر نیچے اتر آیا۔

دھرم شالے کے پچھواڑے، جہاں گنگا بہتی تھی، نہانے کے لیے گھاٹ بنا ہوا تھا۔ گھاٹ کے دونوں طرف چبوترے تھے، جو گھاٹ سے آگے نکل کر گنگا کی تیز دھارا میں گھٹنوں تک بھیگتے ہوئے ٹھہرے تھے۔ بائیں طرف کے چبوترے پر چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا۔ دائیں طرف بیٹھنے کے لیے منقش نشست گاہ بنائی گئی تھی۔ جہاں اس وقت بندروں کی ٹولی چھاؤں میں آرام فرما رہی تھی۔ دو چار نو عمر بندروں کو اطراف سے بے نیاز ہو کر بھاگ دوڑ میں مصروف دیکھا تو جی چاہا کہ میں بھی اس کھیل میں شامل ہو جاؤں۔ اچانک میری نظر اس چھوٹی سی مجلس میں ایک بڑے کٹے خوفناک سے بندر پر پڑی، میں سہم کر رہ گیا۔ وہ بے پرواہی کے ساتھ اپنے جسم کو پھیلائے ہوئے لیٹا تھا۔ تین چار جوان بندریائیں اس کے جسم کے بالوں سے جوئیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھا رہی تھیں۔ اور وہ بے پروا لیٹے لیٹے میری ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

قبل اس کے کہ میرا طفلانہ ذہن کچھ سوچے سمجھے، ایک عجیب سی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں اس جانب متوجہ ہوا۔ نشست گاہ سے متصل اونچی دیوار پر ایک بندر اپنے ساتھیوں سے علیحدہ، میرے جانب پیٹھ کیے ہوئے بیٹھا نظر آیا۔ اتفاقاً اسی وقت وہی عجیب آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، اس نے میری جانب رخ کیا۔ وہ بندر نہیں، بندریا تھی، اس کی چھاتی سے نوزائیدہ بچہ چپکا ہوا تھا_____ نہیں، چپکا ہوا نہیں تھا، وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر چھاتی سے لگائے ہوئے تھی۔ بچہ مرا ہوا تھا، اس کا جسم سوکھ کر سخت ہو گیا تھا، اس کی آنکھیں چیونٹیوں اور مکھیوں کی غذا بن چکی تھیں۔ وہاں بجائے آنکھوں کے دو چھوٹے چھوٹے گڑھے بن گئے تھے۔ ان میں بینائی کہاں۔

اور ہاں، اس کی آنکھوں میں اداسیوں نے اندھے کنویں کھود دیے تھے۔ ان آنکھوں میں نظر تو تھی، مگر اس نظر سے کوئی عکس نہیں ابھر رہا تھا۔ اور وہ عجیب آواز میں گویا بین کر رہی تھی۔ اس کے لیے جو اس کی چھاتی سے چپکا ہوا تھا۔

اس دل گداز آواز کو سنتے ہوئے میرے ذہن پر غم کی بدلی چھا گئی۔ میں اداس ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا، میں رو پڑوں گا۔ مگر واہ ری انسانی فطرت۔ ایک پل تولہ، ایک پل ماشہ۔

جیسے ہی مجھے علم ہوا کہ شام کو ہمارا ہرکی پیری جانے کا پروگرام بنا ہے، تو، میں ذہن کی سطح پر ہرکی پیری کے عکس ابھارنے میں مشغول ہوگیا۔ پتہ ہی نہیں چلا، کب اور کیسے رنج و غم کی بدلی میرے ذہن پر سے چھٹ گئی۔

ہرکی پیری کا منظر اتنا جاذب نظر تھا کہ وہاں سے لوٹ کر دوسرے روز دوپہر تک میں بستر پر لیٹے لیٹے اس دلکش منظر کو آنکھوں میں تازہ کرتا رہا۔ خاص طور پر آب گنگا کی تیز دھارا میں چکنی، چمکتی بڑی مچھلیوں کا پانی کی سطح پر آٹے کی گولیاں کھانے جمع ہو جانا۔ میرا ڈر ڈر کر ان کی چکنی جلد کو چھو کر ہاتھ واپس کھینچ لینا۔ بل کھا کر مچھلی کا پانی میں غوطہ لگانا۔ اور پھر آٹے کی لالچ میں اس ہجوم میں، سطح پر آنے کے لیے جدو جہد کرنا اور کلکاریاں بھرتے ہوئے میرا تالیاں بجانا۔

ایک منٹ۔

_____ذرا گڑ بڑ ہوگئی ہے

نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔

_____اب سب ٹھیک ہے۔

ہواؤں، میں جس جذبہ، کامل سے آپ کو مچھلیوں والا وہ منظر سنا رہا تھا، اس سے اس چھوٹی سی ہنڈیا میں رکھی میرے جسم کی راکھ مسرتِ قلبی سے کانپ اٹھی۔ ہنڈیا میں لرزش پیدا ہوئی۔ میرے بیٹے نے ہتھیلیوں پر رکھی ہنڈیا کی جانب حیرت سے دیکھا۔ تو پنڈے نے پوجا کراتے کراتے اسے پوجا کی طرف توجہ

دینے کے لیے کہا۔

میں ہڑبڑا گیا۔ پوجا میں خلل ہو نا بابا نا۔ کہیں ایسا نہ ہو ـــــــ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم ـــــــ

ہاں، تو آیئے ـــــــ

میں تالیاں بجاتے ہوئے کلکاریاں بھر رہا تھا اور مچھلیاں منہ کھولتی، بند کرتی، بند کرتی، کھولتی پانی کی سطح پر ہلکورے لے رہی تھیں۔

میرے جسم میں جھرجھری سی پھیل گئی، میں چونکا۔ وہ جاذبِ نظر منظر میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ چکا تھا۔ میں نے دیکھا ـــــــ

دوپہر کے کھانے کے بعد میرے پتاجی اور ماں چٹائی پر ایک دوسرے کی جانب پیٹھ کر کے سو رہے تھے۔ بھائی اور رسوئیا غلہ خریدنے بازار کی طرف گئے ہوئے تھے۔ میں اکیلا وہاں کیا کرتا، بلی کی طرح دبے پاؤں نیچے اتر آیا۔

میں یہ سوچ کر نیچے آیا تھا کہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھوں، پانی میں پاؤں بھگوؤں اور دریا کی تیز دھارا سے لطف اٹھاؤں، مگر نیچے میں سیڑھیوں تک جانے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ سیڑھیوں کے قریب ہی، وہ ہٹا کٹا، خوفناک بندر کمر کھجاتے بیٹھا تھا۔ وہ کچھ چبا رہا تھا۔ اس کا گلا دونوں طرف سے پھولا ہوا تھا۔ کچھ بندر مندر کی جانب سے اب بھی آ رہے تھے۔ میں وہیں ٹھٹک گیا۔

پھر وہی آواز، وہی عجیب آواز۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ نشست گاہ کی پشت پر نوحہ گر بندریا، بچے کو چھاتی سے چپٹائے بیٹھی تھی۔

رفتہ رفتہ سب بندر سُستانے کی تیاری کرنے لگے۔ وہ خوفناک بندر منہ میں جمع کی ہوئی خوراک چبا چکا تھا۔ وہ خراماں خراماں گھاٹ پر گیا۔ جھک کر پانی پیا۔ پلٹا، بندریا نے غم آلود آواز نکالی اور اس ہٹے کٹے بندر کے تیور بدل گئے۔ کان اوپر اٹھے۔ بھنویں چڑھ گئیں۔ آنکھیں سرخ ہو کر چوڑی ہو گئیں۔ جسم حملے کے لیے کھنچ کر چست ہو گیا، اور وہ غصہ سے غرّانے لگا۔ بندریا نے اس کے بدلتے

تیور دیکھے تو بغل کی دیوار پر چھلانگ لگائی. خوف زدگی کے عالم میں بھی ایک ہاتھ سے دیوار کے اوپری حصے کو پکڑنے میں وہ کامیاب ہوگئی مگر اوپر پہنچنے میں ناکام رہی. ایک ہاتھ کے سہارے اوپر چڑھنے کے لیے اس نے جدّو جہد شروع کردی۔ اس کی ناکامی نے بندر کے جوش کو دونا کیا. اور وہ ہیبت انگیز آواز کے ساتھ نشست گاہ کی پشت کی دیوار پر چڑھ آیا. جان کا خوف، چھاتی سے لگے بچے کا خیال. بندریا نے دوسرے ہاتھ سے دیوار کا کنارا پکڑا اور اوپر پہنچ گئی ــــــ مگر اس افراتفری میں بچہ ہاتھ سے نکل کر دریا میں گر چکا تھا ــــــ سوکھے چمڑے کا ٹکڑا تھا۔ پانی میں گرا. پانی کی تیز دھارا میں بہہ نکلا۔ بندریا بہتے ہوئے اپنے جگر کے ٹکڑے کو چیختی چلاتی، دیکھتی رہ گئی۔ وہ پانی پر اس طرح جھکی ہوئی تھی جیسے کسی پل بھی دریا میں چھلانگ لگا دے گی۔

نشست کی پشت پر بیٹھے بندر نے یہ تماشہ دیکھا تو دانت پیستے ہوئے چھلانگ لگائی. دیوار پر پہنچتے ہی پانی پر جھکی ہوئی بندریا کو پیٹھ سے دبوچ لیا۔ بندریا نے اسے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ اسے ایسے دبوچے ہوئے تھا. جیسے زمین میں دانت گاڑ دیے ہوں۔ بندریا پانی کی طرف دیکھ کر خُر خُر کی آوازیں نکال رہی تھی۔ ان دونوں کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے دیکھا، بندر کی کمر ہلنے لگی۔ میں تجسس کناں نظروں سے بندر کی حرکت دیکھتا رہا. مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا. البتہ، مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بندریا کی چیخ و پکار رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئی. اس نے پھر بندر سے علیحدہ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اب وہ گنگا کی سطح کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بچہ طلوعِ آفتاب کو دیکھ رہا ہو۔

کبھی کبھی زندگی میں ایسے حیرت ناک واقعات پیش آتے ہیں کہ دفعتاً آدمی اپنے آپ سے سوال کر بیٹھتا ہے ــــــ کیوں ؟ کیسے ؟ کس لیے ؟

میں نے ایک بار اپنے آپ سے ایسے ہی سوال کیے تھے ــــــ مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھاتا ہے ؟ ایک بندریا کو گنگا کی سطح پر طلوعِ آفتاب کا منظر کیسے

نظر آتا ہے؟ یک بیک تپتے لوہے کی مانند میرے کان گرم کیوں ہو گئے؟

تین چار سال بعد آم کے موسم میں جب گرما کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو پتا جی ہم سب کو لے کر ہر دوار آ گئے۔ وہی دھرم شالہ، وہی کمرے، وہی گھاٹ، وہی گنگا کی تیز دھارا، وہی بندروں کی ٹولی، کچھ بھی نہیں بدلا تھا سوائے اس خوفناک بچے کٹے بندر کے، جو اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کا وہ رتبہ، بلند اور ٹولی کی کسی بھی بندریا کو پیچھے سے دبوچ لینے کا حق، ایک نوجوان بندر نے اس سے ہتھیا لیا تھا۔ اب وہ خود اپنے جسم سے جوئیں چن چن کر کھاتا ہوا ایک کونے میں بیٹھا ہوا نظر آیا۔

اس شام میں نشست گاہ کی پُشت پر کہنیاں ٹکائے، گھٹنوں کے بل بیٹھا، دریا کا نظارا کر رہا تھا کہ پانی میں چھپ چھپ کے ساتھ کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی میں نے اس طرف دیکھا۔ بغل کی دھرم شالے کے گھاٹ پر ایک کمسن لڑکی گردن تک پانی میں ڈوبی پانی کی سطح پر ہاتھ مارتے، کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ بھیگی ہوئی زلفوں کی ایک لٹ سانپ کی طرح اس کے چہرے سے لپٹی ہوئی تھی۔ پلکوں پر گنگا کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ اس کا شفاف چہرا دمک رہا تھا۔ میرے جسم میں ہلکی سی کپکپی دوڑ گئی۔ لڑکی اپنے جسم کے ساتھ ڈھیر سارا پانی لیے یک لخت کھڑی ہو گئی۔ جسم کے ساتھ اٹھا پانی، جسم سے پھسلتا ہوا دریا میں مل گیا اور وہ گھٹنوں تک پانی میں کھڑی رہی۔ اس نے نیچے جانگھیا اور اوپر مہین پیٹی کوٹ پہن رکھا تھا۔ لمحے بھر کے بعد اس نے اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے بالوں کو نچوڑا ہتھیلیوں سے چہرے کو پونچھا، بانہوں پر ٹکے چند قطروں کو جسم سے الگ کیا اور پیٹی کوٹ کو برابر کرتے ہوئے جب وہ اپنے ہاتھ کمر تک لے گئی تو میری نظریں اس کے سینے کے ہلکے سے ابھار پر رک گئیں۔ میں نے محسوس کیا جیسے بور سے لدی آم کی ٹہنی پر دو چھوٹی چھوٹی سی کیریاں اُگ آئی ہوں، جنھیں آم بننے کی جلدی ہے۔

میرے کانوں کی لویں گرم ہو گئیں۔

میں نے اپنے آپ سے پوچھا ـــــ کیوں؟ کیسے؟ کس لیے؟

مگر میں دل کو اس کا قابلِ قبول جواب نہ دے سکا۔ میں کسی اور سے کیسے پوچھتا!! کیا پوچھتا!! سوال میرے وجود میں گھٹنے لگا۔ جستجو شروع ہو گئی۔

گرما کی چھٹیاں ختم ہوئیں۔ مدرسہ شروع ہوا۔ اتفاقاً انھیں دنوں بڑی جماعت کے ایک لڑکے سے ملاقات ہو گئی۔ اس سے میری رغبت شاید اس لیے پیدا ہوئی۔ کیوں کہ عمر میں وہ مجھ سے بڑا تھا۔ بیباک تھا۔ کبھی بھی کسی سے بھڑ سکتا تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کی زبان نپی تلی۔ چُست اور گالیوں سے بھرپور تھی۔ میں نے اسے نئی نئی گالیاں ایجاد کرتے سنا تو اس سے یاری کر بیٹھا اور ایک دِن اس کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کانوں کے گرم ہو جانے کا راز جاننا چاہا۔ وہ دیر تک مسکراتا رہا۔ پھر میرے بال بکھیرے۔ آنکھ ماری، بولا ـــــ واہ بیٹے جمورے۔ ابھی سے پر نکال رہا ہے۔ ٹھیک ہے بچو۔ تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی استاد سے پالا پڑا تھا۔

دو دِن کے بعد استاد نے ایک کتابچہ میرے ہاتھ میں تھما دیا ـــــ سالے جمورے۔ یہ خفیہ کتاب ہے۔ کسی کے سامنے نہیں پڑھنا۔ ورنہ جُوتے پڑیں گے۔

لفظ خفیہ کی اہمیت اور جوتے پڑنے کا خوف مجھ پر ایسا غالب ہوا کہ میں نے آدھی رات گھر کی چھت پر کتابچے کا مطالعہ کیا اور کئی دنوں تک جب بھی موقعہ ملا اسے بار بار پڑھتا رہا۔ اس طرح میرے ذہن کی ٹہنی ٹہنی پر شُنگی پک کر آم بنیں اور میں اپنے کانوں کی تپش سے لطف اندوز ہونے کے لیے صنفِ نازک کے سینوں کے ابھار کو گھورنے لگا۔ جس کے لیے مجھے کئی مرتبہ پھٹکار بھی سننی پڑی اور مذاق کا ہدف بھی ہونا پڑا۔ نہ جانے اس عورت ذات میں کُوٹ کُوٹ کر اتنی ماتا کس نے بھر دی ہے! ان کی پھٹکار بھی ماتا سے بھرپور ہوتی ہے اور مذاق بھی لاڈ سے لبریز۔ یہ سمجھتی کیوں نہیں ہیں کہ ممتا اور لاڈ سے

بچے بگڑ بھی جاتے ہیں۔ ان کے دشاسن بننے کے امکانات زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔

اب میں گویا خوابوں کی دنیا میں چلا گیا تھا۔ گولائیاں لیے ہوئے نقطے اردو کے سڈول لفظ لیٹی ہوئی (Supine) سطریں کتابچے کے مفہوم سے نکل کر ذہن کے کواڑوں پر دستک دیتیں۔ روئیں روئیں میں اتھل پتھل سی مچ جاتی تھی۔

میں نے محسوس کیا، جیسے کوئی دشاسن میرے نہاں خانہ، دل میں جنم لے رہا ہے۔ تصوّر عجیب و غریب، اوٹ پٹانگ مگر لذت انگیز نقشے بناتا بگاڑتا اور بگاڑتا بناتا جارہا تھا۔ لیکن اچانک ایک دن سارے نقشے گڑبڑا گئے۔ جب ملک کا نقشہ ہی اپنی شناخت گنوا کر نئی شکل اختیار کرنے والا تھا، تب بھلا میرے ذہنی نقشوں کو کون پوچھتا، کیوں پوچھتا۔

اس دن اتوار تھا۔ صبح صبح میں نے پتاجی کو ماں سے کہتے سنا ــــــ دو تین روز میں ہمیں یہ شہر چھوڑنا ہوگا۔ ملک کے حالات بدترین صورتِ حال اختیار کرتے جارہے ہیں۔ یہ شہر پاکستان میں جائے گا۔

وہ شہر ہمارا آبائی وطن تو تھا نہیں۔ پتاجی نے موسمی پرندوں کی طرح پر تولے اور اڑان بھری۔ دورانِ سفر میں نے دیکھا، صرف ہم نے ہی اڑان نہیں بھری تھی۔ وقت کی نبض کو پرکھ کر جلا وطنی قبول کرنے والوں کی باڑھ سی آئی ہوئی تھی۔ ہر شخص اپنے اسباب اور بیوی بچوں کے ساتھ کسی نئی سمت کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔

پتاجی ہمیں گنگا میا کی پناہ میں ہردوار لے آئے۔ اس مرتبہ وہاں کی ہر چیز بدلی بدلی بے نور بے رنگ سی نظر آرہی تھی، ہر چہرہ لٹکا ہوا، جیسے چہرہ نہ ہوا چمگادڑ ہوا۔ ہر سمت بے حسی کا کہرا چھایا ہوا تھا۔ بندروں کی ٹولیاں بھی اپنے اپنے علاقے سے بے دخل ہو کر جنگل کا رخ کرتی نظر آرہی تھیں۔ آبادی میں بچے کھچے مجبور بندر کھڑکی کھڑکی بھیک مانگتے نظر آرہے تھے۔ انہیں روٹیاں کون دیتا، کہاں سے دیتا، کیسے دیتا۔ لوگوں کو اپنی روٹی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

سب لٹے ہوئے تھے...... کسی کا زر، کسی کی زمین، کسی کی زن، لوٹی گئی تھی تو کوئی بیٹا، کوئی بھائی، بہن یا ماں گنوا کر آیا ہوا تھا۔ سبھی دکھی تھے، دلوں میں ایک ٹیس لیے ہوئے۔ مگر ...... مگر، میرے دکھ میں اور ان کی ٹیس میں اتنا ہی فرق تھا جتنا ہماری دھرم شالہ اور ان کی دھرم شالاؤں میں۔ ہماری دھرم شالہ بمبئی کے ایک سیٹھ کی جائیداد تھی، جس میں رہنے کے لیے اس کی چٹھی کا ہونا لازمی تھا۔ ان کی دھرم شالائیں خیراتی ٹرسٹ کی ملکیت تھیں، جس میں کوئی بھی ڈیرہ ڈال سکتا تھا۔

ہماری دھرم شالہ میں ہم ہی ہم تھے۔
ان کی دھرم شالائیں (Ant-hill) بنی ہوئی تھیں
ہمارا دکھ، ہمارے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔
ان کی ٹیس، ان کے پورے وجود میں اتر گئی تھی۔
بد حواس انسان لازماً غافل ہو جاتا ہے۔ ہر بات سے، ہر چیز سے۔

ہماری دھرم شالہ کے اطراف نہانے اور کپڑے دھونے کے لیے جو عورتیں گنگا کے گھاٹ پر آتی تھیں، وہ بد حواس تھیں، غافل بھی، خصوصاً نہانے کے وقت یا نہا کر لباس تبدیل کرتے سمے۔ جسم کے اوپری حصے کو ڈھانپنے کے معاملے میں۔

میں دھرم شالہ کی نشست گاہ سے ان سینوں کے ابھار کی تاک میں بیٹھا رہتا۔ یہ سب دیکھ کر اب میرے کانوں میں تپش نہیں ہوتی تھی، کان سرخ نہیں ہوتے تھے بلکہ پورے جسم میں بجلی سی لہرا جاتی اور پھر بار بار اس بجلی کا نشانہ بننے کی خواہش کلبلانے لگتی۔

اس سے پہلے کہ میرے اندر کا دشاسن کبھی کسی پاکدامن کو برہنہ کرنے کی جرأت محسوس کرے، قوتِ آسمانی نے ایسا معجزہ دکھایا کہ میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس معجزے نے، اس دن مجھے برہنہ سینوں کے سامنے ہی نہیں، برہنہ جسموں کے

روبرو کھڑا کردیا، خوبصورت، تراشے ہوئے مادر زاد ننگے حسین جسموں کے روبرو ـــــــ وہ بھی مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کی موجودگی میں ـــــــ

آپ یقین مانیے ـــــــ یقین کیجیے میرا ـــــــ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ ہم تینوں ایک ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ حسین عورتیں ہمارے روبرو سراپا ـــــــ

اوہ ـــــــ اف ـــــــ

سنا ہے ـــــــ پڑھا بھی ہے۔

انسان کو مرنے کے بعد، اپنے گناہوں کا پھل بھوگنا پڑتا ہے ـــــــ آج کے دور میں پیدا ہونا ہی سب سے بڑا گناہ ہے۔ جیتے جی انسان جو بھوگتا ہے، وہی کیا کم ہے۔ جو مرنے کے بعد بھی بھوگنا اس کے لیے مقدر کردیا گیا ہے۔

میں نے جیتے جی جو بھوگا، جھیلا ـــــــ صرف ایک چھوٹے سے گناہ کے لیے!!

میں نے کسی کا اغوا نہیں کیا تھا۔

میں نے کسی کی عصمت دری نہیں کی تھی۔

میں نے تو صرف خالقِ عالم کی کاریگری، پیکر تراشی سے متاثر ہوکر صنفِ نازک کی مُدور چھاتیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

میں نے گناہ کیا؟

قبول ہے، میں نے گناہ کیا۔

مگر ـــــــ

ـــــــ میرے ذہن میں کئی سوالات، کئی سالوں سے اٹھتے آئے ہیں۔

میں نے ایسا کیوں کیا؟

کاتبِ تقدیر نے لکھا ـــــــ اس لیے؟

ـــــــ تو، کاتبِ تقدیر کو ایسا لکھنے کی ہدایت کس نے دی؟

میری تقدیر میں اس نے اور کچھ ——— کچھ اچھا ——— چاہے تھوڑا ہی سہی ——— تھوڑا اچھا کیوں نہیں لکھا؟

میرا کیا قصور تھا؟

ٹھیک ہے ——— اس نے گناہ لکھا نا!! مگر، ساتھ ہی اس کی سزا بھی تو لکھ دی۔ جو میں نے جھیلی ——— مرنے سے پہلے۔ جیتے جی۔ حساب برابر ہوگیا۔

پھر اب ——— یم راج کو کیا حساب دینا ہے۔ کون سا فیصلہ سننا ہے اس سے!؟

ان سوالات کے جواب نہ تو میرے پاس تھے، نہ کسی مذہبی کتاب میں مجھے ملے۔ ایسے کافرانہ سوالات میرے ذہن میں پیدا ہونے سے پہلے ——— وہ معجزہ ہوا اس دن ———

میں اور ہمارا رسوئیا جنگل میں جامن کی موج مار کر لوٹ رہے تھے۔ ہم نے ڈاک بنگلے کے باغ میں لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ ایک تجسس پیدا ہوا۔ بھیڑ لگنے کا سبب جاننے ہم بھی آگے بڑھ کر بھیڑ کا حصہ بن گئے۔ میں نے اپنی بغل میں ٹھہرے لالہ جی کی بانہہ کو چھو کر آہستہ سے دریافت کیا کہ ماجرہ کیا ہے؟

رعب دار مونچھوں والے لالہ جی نے، جو طرّے دار پگڑی، پٹھانی شلوار قمیض اور جاکٹ پہنے ہوئے تھے۔ قمیض کے نیچے ٹانگوں کے بیچ اِزار بند کا پھُندنا لٹک رہا تھا ——— میری طرف دیکھا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اپنے قریب لیا، بولے ——— پُتر، میرے کول ٹھہرجا ——— ابھی مہاتما گاندھی اور پنڈت جی آنے والے ہیں۔ تو بھی درشن کر لینا۔

ابھی تو لالہ جی کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ بھیڑ میں کھلبلی مچ گئی، جیسے بھیڑ کو کسی نے کھنگال دیا ہو۔

میں نے دیکھا، پنڈت جی بھیڑ کو کھدیڑتے، دھکوں سے بچتے بچاتے گاندھی جی کو لیے چلے آرہے ہیں۔

رہبرانِ قوم کو دیکھ کر لوگ وقتی طور پر اپنے دکھ درد، رنج و غم، فاقے مفلسی ـــــــ سب بھول گئے۔

زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔

پنڈت جی تب تک باپو کو لے کر ہمارے قریب پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے لالہ جی کو چٹان کی طرح بیچ میں کھڑا دیکھا تو جھنجھلا سے گئے۔ مگر، لالہ جی اپنے آپ میں ایک مخصوص شخصیت تھے۔ پنڈت جی رکے۔ لالہ جی نے جھک کر گاندھی جی کے پاؤں چھوئے۔ ایک بڑا لفافہ انھیں دیا اور ادب سے ٹھہر گئے۔ ہجوم پر سکتہ چھا گیا۔ گردنیں اٹھنے لگیں۔

گاندھی جی نے لفافے میں سے ایک بڑی تصویر نکالی۔

انھوں نے تصویر کو دیکھا ـــــــ

پیچھے کے حصے میں پہاڑ پر آباد قلعہ سے دھواں اوپر اٹھ کر آسمان کو چھو رہا تھا۔ جیسے آتش فشاں پھٹا ہو۔

پنڈت جی نے تصویر کو دیکھا ـــــــ

تصویر کے سامنے کے حصے میں بہت سے لوگ دائرہ بنا کر ٹھہرے ہوئے ہیں ـــــــ کوئی ڈھول بجا رہا ہے، کوئی ناچ رہا ہے، کوئی وحشیانہ حرکت کر رہا ہے، کسی کے ہاتھ میں ننگی، سرخ تلوار ہے، تو کوئی خون سے تر بہ تر چھرا لیے ہوئے قہقہہ لگا رہا ہے۔

میں نے بھی تصویر کو دیکھا ـــــــ

وحشی لوگوں کے دائرے میں کئی جوان، خوبصورت، تراشے ہوئے مجسمے جیسی عورتیں اور لڑکیاں، مادر زاد ننگی ٹھہری ہوئی ہیں۔ کوئی اپنے سینے کو، تو، کوئی اپنی شرم گاہ کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔

اطراف کے لوگوں نے اس تصویر میں جھانکا۔

انھوں نے اپنی بہو، بیٹیوں اور اپنے آبائی وطن کی یہ تصویر دیکھی تو ان کی

آنکھوں میں خون اتر آیا۔

گاندھی جی نے تصویر کو پلٹا، پیچھے لکھی ہوئی تحریر کو پڑھا۔ انھوں نے کہا ـــــــ

اپنی حفاظت کے لیے کسی پر ہاتھ اٹھانا ہنسا نہیں ہے۔

اہنسا کے پجاری کے منہ سے، اہنسا کی یہ تشریح:

لوگوں نے تو سن رکھا تھا۔ اگر کوئی تمھارے گال پر چانٹا مارتا ہے، تو تم اسے اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دو۔

وقت کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔

تشریح بھی۔

مجھے محسوس ہوا ـــــــ گنگا میں کہیں کائی اگ آئی ہے۔

عقیدت میں ڈوبا ہجوم اپنے تصور میں عقیق کی طرح تراشے ہوئے مسیحا کو ایشور کے پیکر میں ڈھالنے میں لگا ہوا تھا۔

میں نے آہستہ سے وہ تصویر لالہ جی کے ہاتھ سے لے لی۔ عقیدت میں ڈوبے ہوئے اس بزرگ کو علم تک نہ ہوا۔

میں نے تصویر دیکھی ـــــــ تصویر کو پلٹا ـــــــ پیچھے لکھی ہوئی تحریر کو پڑھا ـــــــ

"یہ دیکھ کر بھی آپ چاہتے ہیں ہم اہنسا کو اپنائیں؟"

میں نے کانپتے ہاتھوں سے ایک بار پھر تصویر کا رخ پلٹا۔ مجھے محسوس ہوا، جیسے میں ٹوٹے ہوئے آئینے کی کرچیوں میں اپنی شکل دیکھ رہا ہوں۔ تصویر میں جتنے بھی مرد تھے ان سب کے چہروں سے میری شکل ابھر رہی تھی۔ ہر چہرہ مجھے اپنا چہرہ نظر آنے لگا۔ نہ جانے کب تک میں ان چہروں میں ٹکڑا ٹکڑا اپنی شکل دیکھتا رہا۔

لالہ جی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ـــــــ پتر، یہ تیرے

ویکھن دی چیز نہیں ہے، توں کلدا ہندوستان ہے۔ اَج دے ہندوستان نوں نُو مت ویکھ۔

میں نے دیکھا ——— مسیحا چلا گیا تھا ——— بھیڑ چھٹ گئی تھی۔

لالہ جی نے اپنے فولادی ہاتھ سے شبنمی قطروں کو پلکوں سے پونچھا اور ڈاک بنگلے کے پھاٹک کی جانب بڑھ گئے۔

جاتے ہوئے لالہ جی کو اس بات کا علم نہیں تھا، وہ کل کے ہندوستان کو کس موڑ پر کس حال میں چھوڑ کر پلٹ گئے ہیں۔

کچھ دنوں بعد میں نے غور کیا کہ اب میری آنکھیں کسی حسین پیکر کی جانب نہیں اٹھ پا رہی تھیں۔ میں نے گنگا کے گھاٹ پر بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔

——— برسوں بعد۔

میری شادی کی رات، جب میری آنکھیں دُلہن کے سینے سے نظر چرانے لگیں، تب مجھے علم ہوا کہ آسمانی قوت نے کیا گل کھلایا ہے، میرا زیرِ ناف حصہ جیسے فلج کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ اب ناقابلِ حرکت ہو گیا ہے، گویا بجلیاں سرد پڑ چکی ہیں۔

میں اس بوڑھے بندر سے بھی گیا گذرا ہو گیا ——— اپنی بھری جوانی میں ——— میری بد نصیبی یہ تھی کہ میرے جسم میں جوئیں نہیں تھیں، چن کر کھانے کے لیے، وقت گذارنے کے لیے۔ میرے جسم میں تو کرچیاں تھیں، ہر وقت زخم کو ہرا رکھنے کے لیے۔

میں نے ان زخموں کی ٹیس کو جھیلا، صرف ایک آس کے سہارے ———

یہ ایسی بات تھی جیسے کوئی دور جلتے ہوئے دِیے کی لو کی گرمی کے سہارے برف باری میں رات گذارنے کی آس کرے۔

وہ آس تھی ——— جنت کی۔

شاستروں میں کہا گیا ہے ——— جسے اس کا بیٹا آگ دے اور استھیاں

گنگا میں بہائے،اسے جنت نصیب ہوتی ہے۔

جنت حاصل کرنے کا اب یہی ایک راستہ تھا میرے لیے۔میرے ایک بیٹا ہو۔

میں نے حکیموں کے در کھٹکھٹائے۔ دوا خانوں کے چکر کاٹے۔ طبیبوں کے روبرو برہنہ ہوا سارے طبی امتحانوں کے بعد سبھی کی رائے ایک ہی تھی کہ میں جسمانی طور پر ٹھیک ٹھاک ہوں۔ صحت مند ہوں۔ باپ بننے کے قابل ہوں۔ لیکن کسی کی رائے سے تو اس طرح بچہ پیدا نہیں ہوسکتا۔

جنت حاصل کرنے کی دیوانگی میں، میں نے تنسکوں کا سہارا لینا شروع کردیا۔ کبھی کسی نجومی کے سامنے بیٹھتا تو کبھی کسی عامل کے روبرو اپنی باہوں میں تعویذ بندھواتا تو کبھی کسی درگاہ میں جاکر دھاگا باندھتا۔ اس طرح دعاؤں اور منتوں کے درمیان جھکولے کھاتی ہوئی میری قسمت کی ناؤ پھر ایکبار گنگا کے کنارے آلگی۔

کسی اندھے نے اندھے کو راستہ دکھایا۔ جنت کا۔

اس سے میری ملاقات بھجن منڈلی کے جلسے میں ہوئی۔ وہ اپنی پتنی کے ہمراہ بھجن سننے آیا تھا۔ دورانِ گفتگو جب اسے معلوم ہوا کہ میں مارا مارا بھٹک رہا ہوں، تو، اس نے مجھے رائے دی۔ میں ہردوار جاؤں، وہاں گنگا کے کنارے آشرم میں ایک سوامی جی ہیں۔ جن کے پرساد سے کئیوں کو اولاد نصیب ہوئی ہے، رازدارانہ انداز میں اس نے یہ بھی کہا۔ وہ بہت ہی متلون مزاج انسان ہیں، البتہ ایک خوبی بھی ہے ان میں۔ وہ بڑی صاف گو شخصیت کے مالک ہیں۔ جھوٹی آس نہیں دلاتے۔

آپ سے کس نے کہا؟ میں نے سوال کیا۔

میں نے درشن کیے ہیں ان کے۔

کیوں؟

مجھے بھی اولاد ـــــــ وہ پتنی کی طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔

کیا کہا انھوں نے؟ میں نے بات جاری رکھی۔

پل بھر میری پتنی کی طرف دیکھا ـــــــ اور نا کر دی۔

میں دوسرے روز ہی بوریا بستر لپیٹے اپنی پتنی کے ساتھ ہردوار کے لیے روانہ ہو گیا۔

سوامی جی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی میری نظروں نے ان کی قدم بوسی کی۔ زعفرانی لباس کے سہارے میری نظر آہستہ آہستہ ان کے چہرے تک پہنچی تو چندھیا کر رہ گئی میری آنکھوں نے ایسا نورانی چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میری پتنی میرے پیچھے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ اس کی جانب سوامی جی نے نگاہ کی۔ ان کے ہونٹوں پر جگنو کی روشنی جیسی مسکراہٹ چمکی اور گل ہو گئی۔ انھوں نے دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا۔ وتس۔ بھگوان نے چاہا تو، پرساد سے اَوشیہ تمھاری پتنی ماتا بنے گی۔

میں چشم پرنم کے ساتھ ان کے قدموں میں بچھ گیا۔ انھوں نے بڑی شفقت کے ساتھ میری پیٹھ کو چھوا۔

یک بیک مجھے یاد آیا۔ سوامی جی متلوّن مزاج ہیں۔ میں ڈر کے مارے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

ان کی آنکھوں سے بہتی ہوئی رحمت چاند کی ٹھنڈک لیے ہوئے تھی۔

وتس، تم دونوں پوجا پاٹھ کے نیموں کا پالن کر پاؤ گے؟

حکم کریں، پربھو۔

پوجا پچیس دن چلے گی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ رہنا ہوگا۔

جی۔

تم ایک دوسرے کا منہ بھی دیکھ نہ پاؤ گے۔

جی۔

بھگتن کچھ اُتر نہیں دے رہی ہیں۔

آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا پربھو ـــــــ میری پتنی نے دبی آواز میں جواب دیا۔

وہ اور کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ وہ ایک ہندو عورت۔ دیومالا کے کسی کردار کی طرح، پتی کو پرمیشور ماننے والی۔ اس نے آج تک اپنی کسی سہیلی کے کان میں یہ بھنک بھی نہیں پڑنے دی کہ میری کمر مفلوج ہے اور اس کی دوشیزگی ابھی کاشت کی طلبگار ہے۔

انتم بار انہیں ماسک دھرم کب آیا تھا؟

اس غیر متوقع سوال سے میں بوکھلا گیا۔ میں نے پتنی کی جانب دیکھا۔ اس نے اطمینان سے جواب دیا ـــــــ

میں چار روز پہلے ہی سر سے نہائی ہوں۔

اتی اُتم۔ ہم پوجا کل ہی سے شروع کر سکتے ہیں۔

جی پربھو ـــــــ

سوامی جی نے فوراً اپنے شِشیہ کو بلا کر ہدایت دی۔

وتس آنند، پورب دشا کی کٹیر میں بھگتن کے ٹھہرنے کی ویوستھا کی جائے۔ وہ پراتہہ کال سے پوجا میں بیٹھیں گی ـــــــ بھگتن، تم اس کے ساتھ جاؤ۔ یہ تمہارا سامان کٹیر میں پہنچا دیں گے۔

میں نے پتنی کی جانب دیکھا۔ میں نے محسوس کیا، جیسے گوکل کی گائے کو کسی دوسرے مقام پر بھیجا جا رہا ہے ـــــــ پتنی چلی گئی۔

سوامی جی مجھ سے مخاطب ہوئے ـــــــ وتس، تمہیں بدری ناتھ جانا ہوگا۔

جی پربھو۔

وہاں مندر میں ناریل چڑھا کر، وہی ناریل یہاں لانا ہوگا۔ پر واس میں ناریل

کو بھولے سے بھی بھومی کا اِسپرش نہیں ہونا چاہئے۔ ایسا ہونے سے اس کا پربھاؤ جاتا رہے گا۔

جی پربھو۔

سوامی جی نے دایاں ہاتھ اٹھا کر، آشیرواد دینے کے انداز میں کہا______

وتس تمہیں لوٹ کر آنے میں اکیس دن لگ جائیں گے۔ تمھارے آنے تک پوجا کی پُورنا ہوتی کا سمے بھی ہو جائے گا۔

دوسرے روز میں بدری ناتھ کے لیے روانہ ہو گیا۔

سفر کے گرد و غبار سے لدا، تھکن سے چُور، بائیسویں دن میں بدری ناتھ سے پیدل لوٹ کر سوامی جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھیں ناریل پیش کیا۔

انھوں نے پیار سے کہا۔ وتس، تم تھکے ہوئے ہو۔ دو دن وشرام کرو۔ تیسرے دن تمہیں بھی پوجا میں بیٹھنا ہوگا۔ وہ پوجا کا انتم دن ہے۔

تیسرا دن تو پوجا پاٹھ میں یوں گذر گیا کہ پتہ ہی نہیں چلا۔ چوتھے روز گنگا اشنان اور پوجا پاٹھ سے فراغت پا کر، آشرم چھوڑنے سے پہلے سوامی جی کو پرنام کرنے گیا۔ وہاں میری پتنی اسبابِ سفر کے ساتھ واپسی کے لیے تیار تھی۔ ہم دونوں نے سوامی جی کے چرن چھوئے۔

سوامی جی نے سرخ کپڑے میں لپٹا بدری ناتھ سے لایا ہوا ناریل مجھے دیا، کہا______ وتس یہ لو پرساد۔ اپنے شَین گرہ کی چھت پر کسی کونے میں ٹانگ دینا۔ اسے دھرتی پر مت رکھنا۔

انھوں نے میری پتنی کی جانب دیکھا۔ پوجا کے سمے اپنے کان پر رکھے موگرے کے پھول کو میری پتنی کو دیتے ہوئے آشیرواد دیا______

بھگتن، لو پرساد کو اپنے آنچل میں باندھ لو۔ ایشور کرپا سے تمھیں ماترتو پراپت ہو گا۔

پتنی نے ساڑھی کے دامن میں پھول باندھ لیا۔

آشرم سے باہر آکر میں نے تانگا کرایے پر لیا۔ سامان تانگے پر لادا۔ پتنی کو سوار ہونے کو کہا۔ پتنی نے تانگے کے پائیدان پر پاؤں رکھنے کے لیے بائیں پاؤں کے گھٹنے کو اوپر اٹھایا اور دائیں پاؤں کی پنڈلی ساڑھی سے باہر آگئی۔ میری نظر اس گوری، چکنی دھوپ میں چمکتی عریاں پنڈلی پر اس طرح اٹک گئی۔ جیسے برسوں پہلے کم سن سینے کے ہلکے سے ابھار پر اٹک گئی تھی۔ پنڈلی کی چمکتی چکناہٹ برق کے مانند میری نظروں میں اتر گئی۔ کمر میں لچک سی پیدا ہوئی۔ جیسے بے جان جسمے میں خون نے گردش شروع کی ہو۔

میں تانگے پر سوار ہوا۔ تانگہ ہچکولے کھاتا ہوا چل پڑا۔ ہچکولوں کی تال پر ہمارے جسم مَس ہونے لگے۔ اس کے شانے کا لمس ننگے برقی تار کو چھونے کا سا احساس دلانے لگا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ خمار آلود سی بیٹھی ہچکولوں سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ میری نظریں اس کے چہرے سے اتر کر سینے پر رکیں۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ اس کا سینہ اتنا گورا، ایسا شفاف اور ایسی جان لیوا گولائیاں لیے ہوئے ہے۔ میں نے دیکھا۔ تانگے کے ہچکولوں کے ساتھ اس کے سینے کی اٹھانیں ہلکے ہلکے تھرک رہی ہیں۔

میرا ہاتھ گود میں رکھے ناریل پر تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ناریل کی گولائی نرم ہورہی ہے اور میری انگلیاں اس پر گرفت مضبوط کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔

ایک انجانے۔ ان جیے جذبے کو میرا جسم جذب کر رہا تھا۔ میرا جی چاہا ـــــــ جیسے بچھیرا۔ یک بہ یک دولتی مارتا۔ اچھل کود کرتا ہوا یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں بھاگنے لگتا ہے۔ میں بھی تانگے سے اتر کر ـــــــ

میں نے فوراً پتنی کے شانے کو پکڑلیا ـــــــ ایسا نہ کرتا تو یقیناً وہ غیر مہذب حرکت مجھ سے سرزد ہوجاتی۔

پتنی نے جانے کیا سمجھا۔ اس نے ہلکے سے دھکیلتے ہوئے مجھے ذرا دور کیا۔ اپنے جسم کو سمیٹا اور تیز نظروں سے دیکھا ـــــــ

کیا گھر پہنچنے تک بھی صبر نہیں کر سکتے۔

صبر اور میں۔"

صبر کسے کرنا چاہیے؟

جو بے صبر ہو۔

بے صبر کون ہوتا ہے؟

جس کے پاس قوت ہو۔

یعنی کہ ——— میرے پاس قوت ہے؟

یقین مانیے۔ میں بے صبر ہو گیا۔ ثابت کرنے کے لیے میں ———

اسٹیشن آ گیا۔

تانگہ رکا ——— سب کچھ رک گیا۔

میں اترا۔

پتنی اتری۔

اسباب سفر اتارا گیا۔

ہم قلی کے ساتھ پلیٹ فارم پر آئے۔ قلی نے پیڑ کے سائے میں سامان رکھا۔ مزدوری لی۔ چل دیا۔

ٹرین ایک گھنٹہ دیر سے چل رہی تھی۔

یعنی گھر پہنچنے میں ایک گھنٹہ دیر ہو گی۔

سوچا۔ برسوں گذار دیے ہیں ——— ہاتھی گذر گیا۔ دم رہ گئی ہے۔ تو کیا ہوا۔ ارے یہ بھی گذر جائے گی۔

سرخ کپڑے میں لپٹے ناریل کو میں نے درخت کی ٹوٹی ٹہنی پر ٹانگ دیا۔ پتنی کو سامان پر بٹھایا اور میں درخت کے تنے کے سہارے کھڑا رہ کر سوچنے لگا ——— ایک گھنٹہ ——— کیا ایک گھنٹے میں موعودہ طاقت کو آزمایا جا سکتا ہے؟

میری نظروں کے سامنے پتنی کے سینے کی گولائیوں کے بیچ کی وادی تھی اور

سر پر سرخ کپڑے میں لپٹے ناریل کا جادو۔

جب میرے لیے وہاں کھڑے رہنا ناممکن ہوگیا تو میں چہل قدمی کے بہانے چائے خانے کی طرف چل دیا۔ جی نہیں چاہا، چائے نہیں پی۔ آگے بڑھ گیا۔ بک اسٹال کے سامنے رکا۔ رسائل پر چھپی تصویریں دیکھیں تو دولتی جھاڑتے ہوئے اچھل کود کرنے کا جذبہ ایک بار پھر زور پکڑنے لگا۔ گھبرا کر میں اور آگے بڑھ گیا۔ درجہء اوّل کی آرام گاہ کو دیکھ کر خیال آیا ______ کیا ایسا نہیں ہوسکتا ______ ٹرین ایک گھنٹہ دیر سے چل رہی ہے۔ کیا ایک گھنٹہ کافی نہیں ہے؟ ___ ہوسکتا ہے ٹرین کچھ اور دیر سے آئے، درجہء اول کی آرام گاہ خالی ہے، کچھ بھکنے اگر دروازے پر تعینات ___ میں نے دیکھا، آرام گاہ کی کھڑکی کے دروازوں کے شیشے صاف ستھرے ہیں۔ باہر سے اندر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ نہیں۔ ہم دونوں باہر سے۔ جھانکنے والوں کو صاف نظر آئیں گے۔ نہیں، نہیں۔

میں آگے بڑھ گیا۔ میری نظر لوہے کے ستون پر آویزاں اشتہار پر پڑی ایک برق رفتار خیال میرے ذہن میں کوند گیا ___ کیوں نہ کسی ہوٹل ___ دھرم شالے میں ایک دن قیام کیا جائے۔

اچانک بچھیرے کی طرح پلٹا۔ دیکھنے والے چونکے۔

مگر یہ کیا!!

اسبابِ سفر تو تھا۔ صرف اسبابِ سفر تھا، ہمسفر کہاں گیا!؟

میں نے نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ تو پلیٹ فارم کے پچھواڑے نل پر اسے دیکھا۔

ارے بھئی۔ پانی پینا تھا تو میرے لوٹنے کا انتظار کرلیتی ______ سامان کو اس طرح چھوڑ کر ______ زمانہ کتنا خراب ہے۔

میں چونکا۔ تیز قدموں سے قریب پہنچا۔ دیکھا ______

وہ قے کر رہی تھی۔

●●

ہزاروں خواہشیں ایسی......

موت کتنی خوفناک ہو جاتی______

حیات کے آخری لمحے کتنے درد ناک بن جاتے______

انسان کا سفرِ آخرت کیسے کیسے ہولناک مناظر کو جنم دیتا!

خالقِ کائنات کی انسان پر یہ سب سے بڑی رحمت ہے۔ کہ اس نے بسترِ مرگ کے سرہانے کھڑی موت کو دیکھنے کی نظر کسی کو نہیں بخشی۔ ورنہ حیات سے بچھڑنے کے وقت ہوش میں یا نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنے آقا کو یاد کرنے کے بجائے وہ اپنے گھر والوں، رشتہ داروں اور احباب کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر روتے ہوئے گڑگڑاتا______ جیسے پہلی بار مدرسہ جانے والا بچہ ماں کا دامن اور باپ کا ہاتھ پکڑ کر، پیر پٹک پٹک کر روتے ہوئے کہتا ہے______ مجھے نہیں جانا۔ میں نہیں جاؤں گا۔

چند لوگوں کو پھر بھی اپنی موت کا احساس ہو جاتا ہے۔ احساس ہوتا ہے، علم نہیں۔

ہسپتال کے ٹھنڈے کمرے میں پڑے پڑے اسے بھی ویسا ہی اپنی موت کا احساس ہونے لگا تھا۔ مگر یہ احساس مکڑی کی رال جیسا مہین تھا اور اس کی رسی موٹی تھی۔ اس لیے وہ ہلکے سے احساس کو نظر انداز کر کے، اس کی رسی

تھامے سانس لے رہا تھا۔ کہ سانسوں کا سفر ابھی کافی طویل ہے۔

جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو اس نے دیکھا۔ نرس اس کی نبض کو پرکھتے ہوئے، کلائی کی گھڑی پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ بائیں طرف گلوکوز کی الٹی لٹکی ہوئی بوتل قطرہ در قطرہ اس کی رگوں میں اتر رہی تھی، اور ابھی آدھی بھی خالی نہیں ہوئی تھی۔

نرس نے اس کے جسم کی حرارت اور نبض کی رفتار کو کیس پیپر پر درج کیا تو اس نے آہستہ سے کہا ــــــ سسٹر مجھے ذرا تکیے کے سہارے بٹھا دیں گے؟

انیسویں منزل کے کمرے میں، کھڑکی سے قریب، بستر پر بیٹھے بیٹھے اس نے شیشے سے باہر دیکھا۔ رات کی تاریکی نے سمندر کو نگل لیا تھا مگر شہر کی روشنی پر وہ پوری طرح حاوی نہیں ہو پائی تھی۔ عمارتوں کی قطاروں میں سے گذرتی ہوئی روشنی سے جگمگاتی سونی سڑک یوں دکھائی دے رہی تھی، جیسے کوئی طوائف مجرے کے بعد تھک کر سوگئی ہو۔ اور اس کے گلے میں نقلی ہیروں کا نکلس سینے کے ابھار کے بیچ جگمگا رہا ہو۔

آہ بھر کر سیاہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوچا ــــــ میں جب بمبئی کی سڑکوں پر خاک چھانتا پھرتا تھا، تب مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ آج عالی شان ہسپتال کے ٹھنڈے کمرے میں ہوں، تب بھی نیند نہیں آرہی۔

اس نے آسمان سے نظریں ہٹا کر کمرے میں دیکھا ــــــ سامنے کے بستر پر اس کی پتنی پتلی سی چادر میں اپنے بھاری جسم کو لپیٹے خراٹے لے رہی تھی۔ صوفے پر اس کا دوست دھوتی اور کرتے میں اپنے دبلے سے جسم کے ساتھ سکڑ کر سو رہا تھا۔

ایک شریکِ حیات تھی، دوسرا شریکِ رنج و راحت ــــــ شریکِ تنہائی کوئی نہیں تھا۔

انسان تنہائی میں اپنے آپ سے ملنے سے گھبراتا کیوں ہے؟

اسے بھی گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے پتنی کی جانب دیکھا تو یاد آیا ـــــ پینتیس سال پہلے جب وہ اس کی حیات میں شریک ہوئی تھی، تب وہ شاخِ گل کی طرح نرم و نازک تھی، خیر، خوبصورت کہا جاسکے، ویسی تو نہیں تھی، مگر بھدی بھی نہیں تھی۔

یک بہ یک اس کے چہرے پر اداسی چھاگئی، یہ یاد آتے ہی اس کی انا کو ٹھیس لگی کہ اس کی پتنی نے یہ کہہ کر اسے ناپسند کردیا تھا کہ اس کی ناک بہت موٹی ہے۔ جانے پھر کیوں شادی کے لیے رضامند ہوگئی ـــــ شاید اسی لیے ان پینتیس برسوں میں اس عورت نے اپنی قینچی جیسی زبان کو زنگ لگنے نہیں دیا۔

ذہنی کڑواہٹ کو کم کرنے کے لیے وہ اپنی نظریں شریکِ حیات سے ہٹا کر شریکِ رنج و راحت پر لے گیا۔ وہ کافی دیر تک اپنے سوئے ہوئے دوست کو دیکھتا رہا۔ بہت کوشش کرنے پر بھی اسے یاد نہیں آیا کہ وہ پہلی بار کب اس کے سکھ دکھ میں شامل ہوا تھا۔ وہ ماضی کی راہ پر دور ـــــ بہت دور تک ہو آیا، مگر ماضی کے ہر موڑ پر اسے اپنے وجود کے ساتھ اس کی پرچھائیں نظر آئی۔

ماضی کے ایک موڑ پر وہ رکا۔ یہ وہ دوراہا تھا، جس نے اس کی زندگی کو نیا موڑ دیا۔ نئی سمت بخشی، نئی راہ پر لاکر کھڑا کردیا۔

اس نے کمرے کی شفاف دیوار پر نظر ڈالی تو اس موڑ کا منظر فلمی تصویر کی طرح صاف نظر آنے لگا۔

فرنٹیئر میل دادر اسٹیشن پر آچکا تھا۔ مسافر اپنے سامان کے ساتھ اتر رہے تھے۔ وہ پاس کے ہوٹل میں چائے پینے چلا گیا تھا، اس لیے اسے دیر ہوگئی۔ اس نے جلدی سے پلیٹ فارم پر قدم بڑھائے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے ایک مسافر اپنے ٹرنک اور ہولڈال کے ساتھ نظر آیا۔ وہ جھٹ سے لپکا اور

قریب جا کر بولا ــــــ کہاں لے چلوں، بابو جی؟ ٹیکسی میں جائیں گے یا لوکل ٹرین میں؟

لوکل ـــــ جی۔ آئی۔ پی۔ میں

وہ ٹرنک اٹھانے جھکا۔ مسافر نے ٹرنک اس کے سر پر رکھنے میں مدد کی۔ دونوں کی نظریں ملیں مسافر اس کے چہرے کو دیکھ کر، دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور اس نے مسافر کو غور سے دیکھا تو اس کا دِل چاہا کہ وہ ٹرنک پھینک کر بھاگ نکلے۔

شمبھو تم؟ مسافر نے کہا۔

اب اس کا بچا کھچا شک بھی دور ہوگیا کہ وہ منی کانت ہی ہے، اور کوئی نہیں۔

ماضی کے افلاس کی تصویر دیکھ کر وہ گھبرا اٹھا، اس نے نظریں دیوار سے ہٹالیں، اور صوفے پر سوئے ہوئے منی کانت کو دیکھنے لگا۔ تو اسے یاد آیا ــــــ اس وقت منی کانت کتنا صحت مند تھا، دو سال پنجاب کیارہ کر آیا تھا، پوری کا یا ہی پلٹ گئی تھی۔ بھرا بھرا جسم، لال لال ابھرے ہوئے گال، بھاری آواز۔ اور آج؟

دل کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے نہ جانے اسے کب نیند آگئی ــــــ

نیند؟

نیند جو سفرِ آخرت کا ریاض ہے۔

اس کا جسم آخری سفر کا ریاض کرتا رہا اور دھڑکتا ہوا دل جسم پر پہرا دیتا رہا۔

دوسرے دن صبح سے ہسپتال کے کمرے میں کافی بھیڑ ہوگئی، اس کی ہونے والی بہو اور سمدھی اس کے علیل ہونے کی خبر سن کر احمد آباد سے ملنے آگئے۔ وہ ان کے ساتھ بہت دیر تک باتیں کرتا رہا، جس سے دوپہر ہوتے ہوتے تھکان سی محسوس کرنے لگا۔ وہ آنکھیں بند کرکے پڑا رہا، سمدھی نے سمجھا، بیمار کو

...نیند آ گئی ہے۔ اس نے اٹھتے ہوئے شمبھو کی پتنی سے کہا ـــــ میں چلتا ہوں۔ مجھے آج ہی لوٹنا ہے۔

رکیے گا نہیں؟

سنیچر اتوار کو پھر ایک چکر لگا جاؤں گا۔ جیا کو چھوڑ کر جارہا ہوں۔ بلکہ وہ تو اسی شرط پر آئی ہے کہ وہ ان کی تیمارداری کے لیے رکے گی۔

وہ آنکھیں موندے سمدھی کی باتیں سنتے ہوئے، ہونے والی بہو کے لیے فخر محسوس کرنے لگا۔

آنکھوں کے بند کواڑوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دل سے کہا۔ دیکھا، میرا فیصلہ سہی تھا نا؟ میری بہو لکشمی ہے لکشمی۔ بس اس سے گورو کی شادی ہو جائے اور یہ نئی کوٹھی میں پہلا قدم رکھے تو ہم بھی وہاں رہنے چلے جائیں۔ بیکار میں لاکھوں کی کوٹھی دھول پھانک رہی ہے۔

پانی کی طرح روپے بہا کر تیار کی گئی کوٹھی کی تعمیر کی دیکھ بھال کا کام اس نے موہن کو سونپا تھا۔ دورانِ تعمیر ایک دن اس نے موہن سے کہا تھا۔ اماں یار، اتنی عالیشان کوٹھی مکمل ہونے کو ہے، اس میں پہلا قدم تو میری بہو ہی رکھے گی۔

تعمیر مکمل ہوگئی تو اچھا دن دیکھ کر ہزاروں خرچ کر کے اس کے افتتاح کا جشن بھی منایا اور پھر کچھ ہی دنوں میں بڑے بیٹے گورو کی لگے ہاتھوں اچھا گھرانہ دیکھ کر منگنی بھی کر ڈالی۔ پھر شادی کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا کہ بیماریوں نے دبوچ لیا دو مہینے اپنے شہر میں علاج کروانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تو مجبوراً علاج کے لیے بمبئی لایا گیا۔

اچانک اسے خیال آیا، کہ کمرے نے گہری چپ سادھ لی ہے، اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول کر دیکھا تو منی کانت اکیلا دیوار کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پتنی اور بہو سمدھی کو چھوڑنے نیچے تک گئے ہوئے

تھے۔

اس نے نہایت ہلکے سے منی کانت کو آواز دی، منی کانت نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے پاس آنے کا اشارہ کیا، وہ صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

کہو؟

موہن نہیں آیا؟

میں نے فون کر دیا ہے۔ دو تین روز میں آجائے گا۔

اس نے ایک لمحہ منی کانت کی جانب دیکھا اور دھیرے سے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے ذہن میں موہن کی تصویر ابھری، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، جیسے سمندر کے ساحل پر جھاگ پھیل جاتی ہے۔

وہ موہن کو جب بھی دیکھتا تو اسے مجبل گدھ کی یاد آجاتی۔ جس کی گردن کے پر جھڑ گئے ہوں اور وہ اپنی ننگی لمبی گردن یہاں وہاں گھماتے ہوئے، تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مویشی کی لاش کو نوچ رہا ہو۔

ان دنوں موہن وڈگادی سٹہ بازار کے سامنے ایک دکان کے تختے پر سارا دن اپنی لمبی گردن یہاں وہاں گھماتے ہوئے گدھ کی طرح بیٹھا رہتا۔ سٹہ بازار کی بھیڑ سے گھبرا کر وہ بازار کے شور شرابے میں جانے کے بجائے بیڑی پھونکتے ہوئے دکان کے تختہ پر بیٹھا، آنے جانے والے سٹے بازوں کو روک کر اپنی دھوتی کی لمبائی کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنے پاؤں پھیلاتا اور شام تک چھوٹی موٹی بار جیت نوچ لیتا تھا۔

اس نے دل سے گفتگو شروع کر دی۔۔۔۔۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ ہم تینوں روزانہ شام کو وڈگادی کے سٹہ بازار کی اس دکان پر اکٹھے ہو جاتے تھے، میرے اور منی کانت کے وہاں پہنچتے ہی، موہن پکارتا۔۔۔۔۔ گنپت، تین کٹنگ اسپیشل ٹی ہاؤس والا، گنپت تکارام جادو، تین نصف کپ چائے بھیجتا۔ ہم

کافی دیر تک گپ شپ کرتے ہوئے چسکیاں لیتے اور جب ہوٹل کا لڑکا خالی کپ لینے آتا تب ہمارے بیچ گالی گلوچ، تُو تُو میں میں، شروع ہوجاتی۔ حساب لگایا جاتا کہ کل کس نے چائے کے دو آنے چکائے تھے۔ پرسوں کس نے چکائے تھے اور آج کس کو دینے ہیں ـــــ دو آنے!!

صرف دو آنے اور وہ گالیاں ـــــ وہ مفلسی۔

وہ کچھ لمحے خاموش رہا۔ پھر اپنے دل سے مخاطب ہوا۔

منی کانت، دو سال پنجاب رہ کر ایک مہینہ کے لیے بمبئی آیا اور واپس جاتے وقت اس نے ہم دونوں کو بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم اپنے چار کپڑے بغل میں دبا کر اس کے ساتھ ہولیے، نوکری کے لیے۔

پنجاب جانے کے لیے ہم فرنٹیر میل میں سوار ہوئے تو ایک ایسا جوش، ایک ایسی کیفیت میرے وجود پر طاری تھی کہ اس ذہنی تناؤ میں، میں اپنی مفلسی کو بمبئی میں ہی بھول آیا ـــــ اس کے بعد اکثر میں نے اسے ڈھونڈا ہے۔ سٹہ بازار کی گلی میں بھی تلاشا اور بمبئی کی سڑکوں پر بھی، مگر وہ پھر کبھی مجھے نہیں ملی۔

مفلسی کی تلاش!؟ـــ اس کے دل نے سوال کیا۔

ہاں۔ میرا اس کا عجیب یارانہ تھا۔ اب جب کبھی اس کی یاد آتی ہے تو میرا پورا جسم، کستوری ہرن کی ناف بن جاتا ہے اور میں مفلسی کی تلاش میں بمبئی کی سڑکوں کے جنگل میں بھٹکنے لگتا ہوں۔

اس نے چپ اختیار کرلی ـــــ مگر وہ زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکا خاموشی کے سناٹے سے گھبرا کر کہنے لگا۔ ـــ

ہم پنجاب کیا گئے، میرے پیٹ اور بھوک کا رشتہ بدلنے لگا۔ پیٹ کے لیے بھوک پہلے مسئلہ تھی۔ پنجاب پہنچ کر وہ ذائقہ بن گئی۔ بمبئی میں تین کٹنگ کے دو آنے اس دھاگے کے مانند تھے۔ جس میں ہماری گالیاں تو تو میں میں ہمارا یارانہ پرو دیا ہوا تھا وہی دو آنے، لائلپور پہنچ کر ایک گلاس دودھ ـــ ـ ـ گلاس

بھی پنجاب کا ـــــــ کی شکل میں میرے جسم میں خود غرضی بن کر اتر گئے۔
میں خود غرض بنتا چلا گیا۔ وقت بے وقت، موقعہ بے موقعہ، دو آنے اپنے پر خرچ کرنے لگا۔ گلاس دودھ کے لیے، چھولا پوری یا لسی کے لیے، گاجر کا حلوہ اور مال پوا، میرے ذائقہ کی رہبری کرنے لگے۔ جو وہاں ہر نکڑ پر دستیاب تھے۔
وہ پھر ماضی کے آسمان پر پھیلی یادوں کی کہکشاں کی ہلکی سرد روشنی سے لطف اندوز ہونے لگا۔

اسے یاد آیا ـــــــ پنجاب جاتے ہوئے وہ اپنی مفلسی کو بمبئی میں بھول آیا تھا۔ مگر پنجاب سے لوٹتے وقت اپنے ذائقے کو وہاں بھولا نہیں، اپنے ساتھ لیتا آیا، اور اس ذائقے کو پالنے پوسنے کے لیے اس نے زندگی کی شطرنج پر کیسے کیسے داؤ کھیلے، اور کس ہوشیاری سے کھیلے، کتنوں کو ہرایا، کتنوں کی لٹیا ڈبو دی۔
لاشعوری طور پر اس کی زبان ہلکے سے مس کرتے ہوئے۔ ہونٹ پر پھرنے لگی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں منی کانت اخبار کی خبریں چاٹنے میں مصروف تھا اس نے آہ بھری تو منی کانت نے اخبار ہٹا کر اس کی جانب دیکھا۔
وہ کچھ اس انداز سے دیکھ رہا تھا کہ منی کانت کو محسوس ہوا، جیسے اسے کسی چیز کی ضرورت ہے۔
کیا چاہئے؟ ـــــــ پانی پیو گے؟
اس نے سر ہلا کر نا کہا اور پھر دھیمی آواز میں بولا۔
ایک کام کرو گے؟
کہو۔
محمد علی روڈ پر گھسیٹا رام کی دوکان ہے نا، وہاں سے چھولا پوری، اور گاجر کا حلوہ لادو، جی مچل رہا ہے ـــــــ
کیوں؟ مرنے کا ارادہ ہے کیا؟ ـــــــ بے وقوف، ڈاکٹروں نے تجھے

کچھ بھی کھانے سے منع کر رکھا ہے اور تیرے دماغ میں چھولا پوری اور حلوہ پک رہا ہے۔

اس نے پھٹکار سُن کر آنکھیں بند کرلیں اور منی کانت نے اس کی خواہش سے خوفزدہ ہو کر اخبار کا پردہ اپنے چہرے پر ڈال لیا۔

اسے ماضی کے ایسے کئی مقام یاد آئے۔ جب منی کانت نے اسے ایسے ہی ڈانٹ ڈپٹ سنائی تھی۔

اسے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ پہلی بار جب یار کی ڈانٹ تیزاب کے قطروں کی مانند اس کے جذبات کو جلا کر دل میں اتر گئی تھی۔

شبنم کی بوندوں کا تیزاب کے قطروں میں تبدیل ہونے کا معجزہ جس روز ہوا۔ تب تک ان کے بیچ گالی گلوچ اور تو تو میں کی روایت ختم ہو چلی تھی۔ یارانے کی شدت کا جذبہ۔ بے لطف تکلف کی طرح دم توڑ رہا تھا اور اس کے کاندھے، منی کانت کے کاندھوں کے برابر ہو چلے تھے۔ اب وہ کسی کا ملازم نہیں تھا۔ کاروبار میں منی کانت کا برابر کا حصہ دار تھا۔

ایک دن نہ جانے کیسے اس کے دل میں عاشقانہ جذبے نے زور مارا۔ عاشق نے انگلی بڑھائی تو معشوق نے پہونچا پکڑ لیا ہوا یوں ــــــــــــ

گرما کا موسم تھا۔ بلا کی دھوپ قہر ڈھا رہی تھی۔ بینک کا کام نہیں تھا اس لیے دوپہر کا کھانا کھانے وہ کچھ جلد گھر پہنچ گیا۔ اتفاقاً اس وقت اس کی پتنی سبزی، آم اور دیگر گھریلو سامان کی تھیلیاں لیے تانگے سے اتر کر پسینے سے تربہ تر اس کے روبرو کرسی پر بیٹھ کر پسینہ خشک کرنے لگی۔ پتنی کو بے حال ہوتا دیکھ کر وہ پانی کے دو گلاس بھر لایا۔ ایک پتنی کو دیا اور دوسرا اپنے ہونٹوں سے لگا کر بولا ــــــــــــ

سچ پوچھو تو اب گھر میں فرج ہونا چاہیے۔

پتنی نے جھٹ سے کہا ــــــــ چلو اتنے سال بعد ہی سہی، عقل آئی۔

میں مذاق نہیں کر رہا۔

اپنے دوست سے پوچھا ہے؟

واہ بھئی، پیسے میرے ہیں۔ میری کمائی کے ہیں۔ میں کیسے بھی خرچ کروں، پھر اس کے گھر میں بھی تو فرج ہے۔

میرے دیدے ابھی پھوٹے نہیں ہیں۔ جب بھی وہاں جاتی ہوں، سامنے ہی نظر آتا ہے، مگر آپ کا دوست کہے گا، یہ تو میرے باپ کا خریدا ہوا ہے ——— اس کا باپ تو پیسے والا ہے ہاں؛ آپ کے تو نہ کوئی پیچھے پیسے والا ہے نہ آگے۔

پتنی نے پلو کمر میں ٹھونسا، تھیلیاں اٹھائیں اور "ہونہہ" کہہ کر اس کے جذبہ، عشق کی ایسی کی تیسی کرتے ہوئے رسوئی میں چلی گئی۔

دوپہر کے بعد دفتر میں وہ اور منی کانت چائے پی رہے تھے، موقعہ دیکھ کر اس نے فرج خریدنے کی بات چھیڑی تو منی کانت نے فوراً ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا ———

کیوں؟ چار پیسے جوڑے نہیں کہ نوابی سوجھ رہی ہے۔

اسے اچھی طرح یاد ہے ——— اس دن ڈانٹ سن کر، ایک لمحے کے لیے اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ آنکھوں پر ہلکے سے انگلیاں ملتے ہوئے، ناک کی جڑ کو تھاما تھا، ذہن کو اس نقطہ پر مرتکز کیا تھا اور سوچ کی چوسر پر کوڑیاں پھینکی تھیں۔ نتیجتاً پانچویں روز بمبئی سے اس کے سالے کا خط آیا، جس میں ایک چھوٹی سی پرچی کے ساتھ چار ہزار روپے کا بینک ڈرافٹ نکلا تھا۔ پرچی پر لکھا تھا ———

"آج کل گرما کا موسم ہے، آپ کے وہاں تو گرمی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ میں نے اپنی بہن کو آج تک کچھ نہیں دیا، اس لیے روپے بھیج رہا ہوں، میری طرف سے میری بہن کو فرج دلادیں۔"

اس کامیابی کے بعد اس نے معمول سا بنالیا۔ جب بھی موقعہ ملتا، سوچ کی چوسر بچھا کر کوڑیاں پھینکتا۔

دونوں کاروبار میں برابر کے حصے دار ہونے کے باوجود، وہ مالی طور پر منی کانت سے بہت آگے نکل گیا اور منی کانت تماشائے اہلِ کرم دیکھتا رہ گیا۔

یادوں کی تپش میں تپ کر شام تک اس کی صحت میں اتنی گراوٹ آگئی کہ ہسپتال کے کمرے میں نرس کے سینڈل کی ٹک ٹک۔ مریض کے دل کی دھڑکنوں کی طرح بڑھ گئی ڈاکٹروں کی آمد و رفت نے کمرے کے تناؤ کو بڑھا دیا۔ کئی اسپیشلسٹ بلالیے گئے۔ مریض کی آس کی رسی کو مضبوط کرنے کے لیے۔ اسے آکسیجن پر رکھا گیا رشتہ داروں اور جان پہچان والوں کی بھیڑ بڑھنے لگی۔ بڑھتے ہجوم کو دیکھ کر نرس نے دعا اور دوا کو علیحدہ کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کیا اور باہر تختی لگادی Visitors not allowed

کمرے میں علم و حکمت نے جدو جہد شروع کردی۔ کمرے کے باہر بے بس رشتے دار دعا و منت میں جٹ گئے۔

ڈاکٹروں نے دن دیکھا نہ رات، اس کے سرہانے کھڑی موت کو کھدیڑنے میں لگے رہے۔ گھر والوں نے چار دن اور پانچ راتیں انگوٹھوں پر گذار دیں، تب کہیں جا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔

ہوش میں آتے ہی اس نے نرس کو آکسیجن سلینڈر اور دوسرے لوزامات کمرے سے ہٹاتے دیکھا، تو اسے یقین ہوگیا کہ پیسوں سے خریدی ہوئی سانسوں سے زندگی کا سفر طے نہیں کیا جاسکتا۔ تو پھر ان ہزاروں خواہشوں کا کیا، خصوصاً بہو کے نقشِ پا کے بعد نئی کوٹھی میں مقیم ہونے کی آرزو کا کیا ہوگا؟ اس کی تکمیل کیسے ہوگی؟

اس نے گھبراہٹ محسوس کی، چہرے پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ گھٹن سی ہونے لگی تو نرس سے عاجزی بھرے لہجے میں التجا کرتے ہوئے اس نے منی کانت

کو طلب کیا۔

نرس نے ایک لمحہ جانے کیا سوچا، پھر بولی۔

ٹھیک ہے، زیادہ باتیں نہیں کرنا۔ You are not allowed to talk more

کوئی کسی کو بات کرنے سے منع کرسکتا ہے، سوچنے سے تو روک نہیں سکتا۔

نرس نے پیٹھ پھیری، اور اس نے سوچنا شروع کر دیا۔

سوچی ہوئی ساری باتیں منی کانت کو کہنے کے لیے وہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور اس نے اپنی پتنی اور بیٹے کو اپنی طرف تیز قدموں سے آتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہرے پر فکر اور خوف کے آثار دیکھ کر ان کی تسلی کے لیے وہ مسکرایا۔ مگر پتنی کی نظروں سے اس کی مسکراہٹ کا پھیکا پن چھپ نہیں سکا۔ اس نے بستر پر بیٹھ کر، سینے پر رکھے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے تھپتھپایا مگر اس کا لمس بھی مریض کی حوصلہ افزائی نہ کرسکا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو تسلی دینے کی کوشش کی مگر، دونوں ناکام رہے۔ نتیجتاً پل بھر کے لیے سناٹا چھا گیا۔

سناٹا جو موت کی نشانی ہے۔ موت کے خیال سے بھی وہ خوف زدہ تھا۔

اس نے بڑبڑا کر جھٹ سے سوال کیا ـــــــــ منی کانت کہاں ہے؟

دوائیاں لانے گئے ہیں۔ کیوں؟ کیا بات ہے؟

پتنی کے لڑکھڑاتے الفاظ اور لرزتی آواز کو سن کر اس نے محسوس کیا، جیسے اس کی آرزو کی دھنک سراب میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ سے ڈر کر پتنی نے پوچھا ـــــــ

آپ کو کچھ کہنا ہے؟

منی کانت کو بلاؤ ـــــــــ

اس نے آنکھیں موند لیں۔ ماں بیٹے نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر تناؤ کی لکیریں اور تیکھی ہوگئیں۔ مریض کے قدموں کے پاس رکا ہوا بیٹا چل کر اس کے سرہانے جا ٹھہرا۔ اس کے چلنے سے جو سایہ مریض کی بند آنکھوں پر سے گذرا تو اسے محسوس ہوا ـــــ کوئی ہیولیٰ اس کے سرہانے آکر ٹھہرا ہے۔

ڈرے ہوئے خرگوش کی مانند اس کا جسم تھرتھرایا۔ اس کی آنکھیں ایسے کھلیں جیسے طوفانی ہوا کے جھونکے سے بند دریچے کے پٹ کھل گئے ہوں۔

آنکھیں کھلتے ہی سرہانے کھڑے بیٹے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایسے دیکھنے لگا، جیسے یمراج سے التجا کر رہا ہو کہ مجھے کچھ دن اور جینے کی مہلت دے دو، میری ایک اِچھا ہے، وہ پوری ہو جائے تو پھر لے جانا مجھے۔

پتنی نے اسے بیٹے کی جانب ایسے دیکھتے ہوئے دیکھا، تو اس کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں بھیگی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا ـــــ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

پتنی کے سوال پر اس نے نظریں گھمائیں۔ اس کی ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھا تو اس کا ہاتھ تھام لیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ میری ایک اِچھا ہے۔

اسے دھیمی آواز میں بات کرتے دیکھ کر پتنی نے سوچا شاید وقت آگیا ہے۔ وہ ٹھیک سے اس کی بات سُننے کے لیے اپنا کان اس کے منہ کے پاس لے گئی۔

پتنی کو اس طرح پیش آتے دیکھ کر اسے یقین ہوگیا کہ ان لوگوں نے میرے بچنے کی امید چھوڑ دی ہے۔ اس نے دل کی بات کہنے کے لیے لب کھولے تو بیٹے نے بھی جھک کر اپنے آپ کو اس کے قریب کرلیا۔

بہو کہاں ہے؟

باہر ہے، بلاؤں؟

اس نے پتنی کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

میری ایک ہی اِچھا ہے۔

کہیے، کیا کہنا ہے۔

پتنی نے بیٹے کی جانب دیکھا۔ بیٹے کے چہرے پر اسے تجسس اور گہرا ہوتا ہوا نظر آیا

کل ــــــ یہاں، اس کمرے میں ــــــ گورو کی شادی کر دو ــــــ

اس کی بات سن کر جھکا ہوا بیٹا تن کر سیدھا ہوگیا۔ اس نے پتنی کی طرف دیکھا۔ پتنی نے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا ــــــ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ہو سکتا ہے ــــــ دو ہار منگاؤ ــــــ میرے سامنے وہ ایک دوسرے کو ہار پہنا دیں بس ــــــ

پتنی نے بیٹے کا ردِ عمل جاننے کے لیے اس کے چہرے کو پڑھنا چاہا مگر اس کی نظریں مایوس ہو کر لوٹ آئیں۔

پھر مجھے گھر لے چلو ــــــ ہم سب ــــــ نئی کوٹھی میں جا کر رہیں گے۔

بے بس آرزو سے لبریز ہوتی ہوئی اس کی بات ابھی پوری بھی نہ ہو پائی تھی کہ بیٹے کی آرزو اس کی آرزو کے پیمانے کو چکنا چور کرتے ہوئے کمرے میں گونج اٹھی ــــــ

ممی، میں اور جیا کہیں بھاگے نہیں جا رہے۔ پہلے تم ان سے وہ پوچھ لو، جو پوچھنے ہم یہاں آئے ہیں۔

وہ بے بسی سے پتنی کا منہ تکنے لگا۔ جھُنجھلانے کے انداز میں وہ بولی ــــــ

اجی کچھ نہیں۔ ہم تو یہ کہہ رہے تھے کہ آپ نے اگر کسی کو دو نمبر کے روپے دیے ہیں تو کہیں لکھ کر رکھا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں لکھا ہے تو نام اور رقم بتا دیجیے۔ وصول ہم کر لیں گے۔

یکایک اس کے بائیں طرف کی بانہہ میں ٹیس اٹھی۔ جو یک لخت سارے ہاتھ میں درد بن کر پھیل گئی۔

اتفاقاً تبھی دروازہ کھلا۔ منی کانت، دوائیاں اور انجکشن کی شیشیاں لیے نرس کے ساتھ داخل ہوا۔

نرس نے اندر آتے ہی محسوس کیا کہ کمرے میں پھر بھیڑ جمع ہو رہی ہے، اس نے ماں بیٹے کو باہر بھیج دیا اور منی کانت سے دوائیاں لے کر کہا ——

آپ یہاں بیٹھیے، میں انجکشن تیار کر کے لاتی ہوں۔

نرس چلی گئی۔ منی کانت نے پلٹ کر اپنے دوست کے اداس چہرے کو دیکھا تو اس کے روبرو، اسٹول پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے بولا —— اماں یار، تم بالکل پلپلے قسم کے آدمی ہو، ذرا کچھ ہوا نہیں کہ نروس ہو جاتے ہو۔

اپنے ہم نفس کی بات سن کر درد سے کراہتے ہوئے اس کے چہرے پر زرد مسکراہٹ ابھر آئی۔

سالے، الو کے پٹھے، ہنسنا تو ایک طرف، ٹھیک سے مسکرانا تک بھول گیا ہے کیا؟ —— مسکرا۔ دیکھوں —— مسکرا۔ گھسیٹے کی چھولا پوری نہیں کھانی ہے تجھے؟

دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ جس چیز کی تلاش میں وہ بمبئی کی سڑکوں اور دو گادی کے سٹہ بازار کی خاک چھانتا پھرتا تھا وہ گراں بہا چیز اس سرد کمرے میں کہیں سانس لے رہی ہے۔ ان سانسوں کا گرم لمس اسے چھو کر گذر گیا ہے جس کی سوندھی سوندھی گندھ اس کے ذہن کو تر کر گئی ہے۔

سینے میں درد اٹھا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ سینے کو ہلکے سے مسلتے ہوئے وہ مسکرایا۔ سرخ مسکراہٹ کے ہمراہ تازہ گلابوں سی ہنسی بھی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا ——

نہیں یار، اب چھولا پوری کھانے کی کوئی آرزو نہیں رہی۔

تو حلوہ، مال پوا، لسی، بول کیا چاہئے؟

کچھ بھی نہیں ـــــــ آج سب کچھ مل گیا ـــــــ سب کچھ دیکھ بھی لیا۔

وہ پھر اداس ہوگیا۔ منی کانت نے پھر ایک موٹی سی گالی داغتے ہوئے کہا۔

سالے، چپڑ گنجو ـــــــ برسوں بعد آج میرا یار ہنسا ہے۔ ہنس کر کہے تو جان بھی دے دوں ۔

اس کے سینے میں درد شدت اختیار کرنے لگا۔ جسم بھر میں پسینے کے چشمے پھوٹ نکلے۔ اس نے منی کانت کا ہاتھ تھام لیا۔

میری ایک آرزو ہے۔

بول میرے یار، ہم پھر کس مرض کی دوا ہیں۔

منی کانت کا ہاتھ دباتے ہوئے درد بھرے لہجے میں اس نے کہا ـــــــ

موہنیے کے آتے ہی ہم تینوں ریڈیو ٹاکیز میں فلم دیکھنے چلیں گے۔ جہاں ہم نے کبھی "تھری مسکیٹیرس" دیکھی تھی۔

اس بات کو سن کر منی کانت نے کھل کر ہنستے ہوئے کہا ـــــــ

بیوقوف، اب ریڈیو ٹاکیز کہاں ہے! وہاں تو شاپنگ کامپلیکس بن گیا ہے

نرس انجکشن کی سیرنج لے کر داخل ہوئی اس نے مریض کو دیکھا تو چونک گئی، اس نے جھٹ سے مریض کی کلائی تھامی اور نبض دیکھنے لگی

اب تک درد کالی گھٹا کی طرح اس کے چہرے پر چھا گیا تھا، منی کانت بھی خوفزدہ ہوکر کھڑا ہوگیا۔ ڈوبتی نبض کو چھوڑ کر نرس نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا تو ہاتھ بھیگ گیا۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے پلٹی تو اس نے نرس کا ہاتھ کس کر تھام لیا۔

سسٹر ـــــــ ریڈیو ٹاکیز ـــــــ کیوں لوگ ـــــــ اونچی اونچی ـــــــ

نرس نے کلائی پر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوتے ہوئے محسوس کی۔ اسے ایسا لگا کہ اس کی کلائی کی ہڈی چٹخ جائے گی۔

لمحے بھر میں اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ گردن لڑھک گئی۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

●●

موسمی پرندے

دروازہ بند کر کے وہ پلٹنے کو ہی تھے کہ ان کی نظر دیوار پر لگی ہوئی اپنے نام کی تختی پر پڑی۔ وہ رک گئے۔ چہرے پر ہلکی سی جھنجھلاہٹ طاری ہوئی۔ سفاری کے اوپر کی جیب سے رومال نکالا۔ پیتل کی تختی پر لگے ہوئے انگلیوں کے نشان پونچھے۔ چمکتی ہوئی تختی کو اور چمکا کر پر کیف نظروں سے تختی کے حروف پڑھے۔

رحمتُ اللہ خاں بخاری۔ ریٹائرڈ جج ہائی کورٹ۔

بھرپور زندگی جیتے ہوئے۔ جناب رحمت اللہ خاں بخاری عمر کی اس منزل تک آگئے تھے جہاں کسی بھی موڑ پر زندگی انھیں الوادع کہہ سکتی تھی۔ چھ فٹ سے زائد ان کا بلوچی قد۔ بالوں کی برف جیسی ٹھنڈی سفیدی اور چھوٹی چھوٹی شاہین آنکھیں ان کی شخصیت کے رعب کو کچھ بڑھا دیتی تھیں۔

شوفر نے کار کا دروازہ کھولا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

پانی کے آہستہ خرام ریلے کی طرح دھیرے سے کار نے چلنا شروع کیا۔ اور شہر کے باہر آتے آتے۔ باڑھ کی طرح اپنی منزل کی جانب بڑھنے لگی۔

دس سال پہلے وہ اپنے اکلوتے بیٹے اور بہو کو چھوڑنے ایرپورٹ جارہے تھے۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ان کی اہلیہ خدیجہ بیگم۔ بیٹے اور بہو کے درمیان ان کی بانہوں میں باہیں ڈالے انہیں ہدایتیں دے رہی تھیں کہ امریکہ میں انہیں کن کن

کے لیے احتیاط برتنا ہوگی۔

دیکھو بیٹے، گوشت کھانے کی خواہش ہو تو گوشت ہمیشہ کسی مسلمان کی دکان سے ہی خریدنا۔

کیوں امی؟

سنا ہے وہاں سور کا گوشت ہر جگہ بکتا ہے۔ تم نے گوشت کبھی خریدا نہیں، تو حلال، حرام کی تمیز کیسے کرو گے۔

ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر آئی نہیں کہ چلی گئی۔ وہ روشن مسکراہٹ جو اُن کے سدا بہار صحت مند چہرے کو منور کر دیا کرتی تھی، مدتوں پہلے غائب ہو چکی تھی ـــــــــــ وہ ایک عام سی شام تھی جب انھوں نے خدیجہ بیگم کو سپردِ خاک کیا تھا۔

کار رکی، شوفر نے دروازہ کھولا، وہ کار سے اترے اور ایر پورٹ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ یادیں بھی ان کے ہمراہ یوں چلنے لگیں جیسے خدیجہ بیگم اپنے بیٹے، بہو کی پیشوائی کے لیے ان کے پہلو بہ پہلو چلا کرتی تھیں۔

انھیں یاد آیا ـــــــــ

جب انھوں نے فون پر اپنے بیٹے کو اس کی ماں کی موت کی خبر سنائی تھی تو وہ کیسا ٹوٹا تھا، بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر کیسے رویا تھا اور فوراً ہندوستان لوٹ آنے کے لیے کیسا تڑپ اٹھا تھا۔

بیٹے کے لوٹ آنے کی خبر ان کے لیے پریشان کُن تھی۔ ویسے انھیں بھی اب کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ بیوی کی موت سے وہ صرف ٹوٹے ہی نہیں تھے، بکھر بھی گئے تھے، مگر بیٹے کا مستقبل ان کے لیے زیادہ اہم تھا۔ اسے ابھی گرین کارڈ ملا نہیں تھا۔ اگر وہ مرحوم ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور باپ کے غم میں شریک ہونے کے لیے ہندوستان دوڑا آتا ہے تو امریکہ کے دروازے اس پر بند ہو جائیں گے۔ بیٹے کی نوحہ گری سے ماں تو لوٹنے سے رہی، لیکن بیٹے کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔

انھوں نے بڑی مشکل سے بیٹے کو سمجھا بجھا کر ہندوستان آنے سے روکا اور

خود کورٹ کے کاموں میں اتنے مصروف ہوگئے کہ انھیں اپنے رٹائر مینٹ کا علم تب ہوا جب کورٹ کے ساتھی اور وکیل انھیں فیرویل پارٹی کی دعوت دینے آئے۔

لاوڈ اسپیکر پر نیو یارک سے آنے والے ہوائی جہاز کے لینڈنگ کرنے کا اعلان سُن کر انھوں نے یادوں پر اپنے ذہن کے دروازے بند کر لیے اور بڑی تیزی سے شیشے کے اس دروازے کی جانب بڑھے جہاں سے نیویارک سے آنے والے مسافر باہر نکلنے والے تھے۔

شیشہ کے دروازے پر انتظار کرتے ہوئے ان کے گھٹنوں میں درد ہونے لگا۔ تب ہی انھوں نے دیکھا کہ نیویارک کا اکادکا مسافر ٹرالی میں سامان لادے آرہا ہے۔

رحمت اللہ خاں کے جسم میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ رفتہ رفتہ مسافروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ چھ فٹ کے رحمت اللہ خاں پنجوں کے بل اوپر ہوکر اپنے بیٹے کو تلاش کرنے لگے۔ آخر کار ان کی نظروں نے بیٹے اور بہو کو اس ہجوم میں ڈھونڈ نکالا۔ شیشے کے دروازے سے باہر آتے ہی بیٹا باپ سے لپٹ گیا۔ باپ نے بیٹے کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔ دونوں گلے کیا ملے کہ درد کے بادل پھٹ پڑے، دونوں کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی برسنے لگی۔ بہو پریشان ہوگئی بچے سہم گئے۔ انھوں نے اپنے باپ کو روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بچوں کو سہما ہوا دیکھ کر بہو نے شوہر اور خُسر کو دلاسا دینا شروع کیا۔ رحمت اللہ خاں نے مقام اور موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو پایا بیٹے کے کندھے سے سر اٹھاکر پرنم آنکھیں کھولیں تو بیٹے کے پیچھے ایک ننھی پیاری سی بچی کو کھڑا دیکھا۔ جو انھیں اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی عجوبہ ہوں۔

اشکوں سے تر جھلملاتی نظروں سے انھوں نے اس بچی کو دیکھا تو انھیں محسوس ہوا۔ جیسے پیدا ہونے کے وقت وہ خدیجہ بیگم کی ناک اور آنکھیں چرا کر لے آئی ہے۔ ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انھوں نے ہلکے سے بیٹے کو ایک طرف ہٹایا اور اسے پکڑنے، بچوں کی طرح دھیرے دھیرے قدم

بڑھاتے تتلاتے بولے۔۔ارے ہمارا چور۔ یہاں چھپا ہوا ہے اِیں ـــــــــــ
بچی ڈر گئی پاپا کو رلانے والا اس کا کیا حال کرے گا۔ یہ سوچ کر ماں کی ٹانگوں میں گھسنے لگی اور Teddy bear سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ جسے وہ تھامے ہوئے تھی۔
رحمت اللہ خاں نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بھالو کا کھلونا ان کا منہ چڑاتا نظر آیا

ایسا نہیں کرتے Honey darling he is your grandpa بیٹے ـــــــــ ماں نے بڑے پیار سے کہا مگر بچی نے پھر بھی اپنے چہرے سے بھالو کو ہٹایا نہیں الٹے ماں کی ٹانگوں میں جگہ بنانے کی اور کوشش کرنے لگی جس سے ماں کو ٹھیک سے ٹھہرنا بھی مشکل ہو گیا۔
رحمت اللہ خاں نے مایوس ہو کر اپنے آٹھ سال کے پوتے کو قریب کر لیا اور اس کے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ مگر ان کی للچائی ہوئی نظریں بار بار پوتی کی جانب گھوم جاتیں جواب ٹیڈی بیر کی آڑ سے چوری چوری انھیں دیکھ رہی تھی۔
ان دونوں کی آنکھ مچولی کا سلسلہ تب ٹوٹا۔ جب بیٹے کے اصرار پر کار شہر کے اس قبرستان کے پھاٹک پر رکی جہاں خدیجہ بیگم دفن تھیں۔
بیٹا۔ ماں کی قبر کے پاس بڑی عقیدت سے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور قبر کے سبزہ پر ہلکے سے یوں ہاتھ پھیرنے لگا۔ جیسے ماں کی دھانی چنری کو سہلا رہا ہو ـــــــــ اس ڈر کے ساتھ کہ کہیں ماں کی نیند میں خلل نہ پڑے۔
رحمت اللہ خاں بیٹے کے جذبے کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ بیوی بھی شوہر کے جذبات سے واقف تھی۔ مگر بچے اپنے پاپا کی اس عجیب و غریب حرکت سے حیران تھے۔

Whypapaissittingheremama?

چھوٹی بچی نے پھاٹک کے پاس جا کر معصومیت سے اپنی ماں سے سوال کیا۔
پاپا کی مما یہاں پر ریسٹ لے رہی ہیں۔ او کے۔
رحمت اللہ خاں نے بہو کی آواز میں کپکپی محسوس کی

"IsThereanyBasement?WherePapa'smamaissleeping.

yes,honey.

رحمت اللہ خاں نے دیکھا، بہو نے چھلکتی آنکھیں خشک کیں۔ بچی کو اٹھایا اور کار کی طرف چل دی ــــــ بچی ماں کے کندھے پر ٹھوڑی رکھ کر، قبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی ــــــ ہم پاپا کی مما کو گھر لے چلیں گے۔

Let her sleep in my bedroom.

پوتے نے دھیرے سے رحمت اللہ خاں کا ہاتھ تھاما۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ پوتا پلٹ کر چلنے لگا۔ وہ بھی ساتھ ہو لیے۔

کچھ قدموں کے فاصلے پر آکر، ایک درخت کے پاس دونوں رکے۔ رحمت اللہ خاں نے دیکھا، پوتا سر جھکائے پیر تلے کی گھاس کو جوتے سے آہستہ سے کھرچ کر نکال رہا تھا۔

پوتے کو امریکہ میں graveyard دیکھنے کا اتفاق تو کئی بار ہوا، اکثر دور سے اور دو ایک بار قریب سے بھی۔ مگر قبرستان دیکھنے کا اس کا یہ پہلا موقعہ تھا۔

پوتے نے سر اٹھایا۔ رحمت اللہ خاں نے محسوس کیا کہ شاید بچہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔ رچارڈ جے نے حسبِ معمول جملہ دہرایا۔

تمھیں کچھ کہنا ہے؟

گرانڈپا، آپ نے گرانڈ ماں کے گریو کو پکا کیوں نہیں بنوایا۔ دیکھیے نا اس پر گراس اگ آئی ہے۔

رحمت اللہ خاں نے مڑ کر خدیجہ بیگم کی قبر کی جانب نظریں گھمائیں۔ بیٹا ہاتھ اٹھائے دعا کر رہا تھا۔

پوتے کی طرف دیکھا۔ پنجوں کے بل بیٹھ کر اپنے قد کو پوتے کے قد کے برابر کیا، اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کے بولے ــــــ

بیٹے! اسلام میں قبر کو پکا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ It is not allowed in Islam. Ok

Ok grandpa.

پوتے نے اطراف دیکھا اور پھر بولا ــــــ کیا Cleanliness بھی allow نہیں ہے اسلام میں؟

جو شخص اپنے قانونی پیشے میں کبھی کسی سوال کو سن کر پریشان نہیں ہوا تھا وہ آج پوتے کے چھوٹے سے سوال کو سن کر بوکھلا گیا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے، وہ ڈوب رہے تھے کہ ان کا بیٹا گھر جانے کے لیے ان کے پاس آکر رکا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کھڑے ہوکر انھوں نے پوتے سے تو کیا بیٹے سے بھی اپنے قد کو اونچا کر لیا۔ وہ چل پڑے۔ کار کی جانب۔ ایک مغرور چور کے مانند۔

انھوں نے اپنے چہرے پر سنجیدگی اوڑھ لی تاکہ پکڑے نہ جائیں۔ بڑھتی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش شروع کردی تاکہ چند قدموں کا فاصلہ بغیر لڑکھڑائے طے کرسکیں۔ مگر آنکھوں پر ان کا بس نہ چلا، آنکھوں نے پہلے دائیں طرف دیکھا ـــــــ اس طرف کچھ مویشی قبروں کو روندتے ہوئے گھاس چر رہے تھے۔ نظریں بائیں طرف گھوم گئیں تو دیکھا کچھ لونڈے قبروں کو تکیہ بنا کر جوا کھیل رہے تھے۔ وہ گھبرا گئے۔ پوتے کی نظر ان سب پر پڑگئی تو جانے کیا پوچھ بیٹھے۔ اس ڈر سے قدموں کو تیز کرتے ہوئے سامنے دیکھا ـــــــ مگر سامنے کیا دیکھتے ہیں کہ جس پگڈنڈی پر وہ چل رہے تھے، اس پر سامنے سے ایک ہجوم ان کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے، لڑتے، جھگڑتے، بھونکتے کتوں کا ہجوم۔ آگے آگے ایک کتیا ہانپتی ہوئی، پیچھے پیچھے رال ٹپکاتے ہوئے کتے۔

وہ کچھ دوڑتے، کچھ لڑکھڑاتے، لاحول پڑھتے کار کی جانب بڑھے۔ بیٹے اور بہو نے اس منظر کو نظر انداز کر دیا۔ بچوں کے لیے تو یہ منظر ناقابلِ اعتبار تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اتنے سارے کتے لاوارث، آوارہ بھٹک سکتے ہیں۔ انھوں نے کبھی ایک کتے کو بھی یوں آوارہ گردی کرتے نہیں دیکھا تھا۔

رحمت اللہ خاں گھر پہنچتے ہی بیٹے، بہو اور بچوں کی دیکھ بھال اور خاطر تواضع میں اتنے منہمک ہوگئے کہ اس ہندوستانی منظر اور امریکن سوال سے پیدا شدہ پریشانی کو بھول گئے ـــــــ اور پھر بھلا، قبرستان میں پیدا شدہ خیالوں کے بوجھ کو اٹھائے انسان کب تک جی سکتا ہے!

خاطر داری کے جھمیلوں میں الجھے رہنے کے باوجود، رحمت اللہ خاں بہت پریشان تھے۔ انھیں یہ بات بڑی شدت سے ستا رہی تھی کہ چار روز ہوگئے اسے گھر آئے، پھر بھی ابھی تک یہ اس کا بوسہ نہیں لے پائے۔ نہ ہی اسے سینے سے لگانے میں کامیاب ہوسکے۔ اس پر ستم یہ کہ بار بار کواڑ کی آڑ سے وہ انھیں اکسا رہی تھی۔

درحقیقت چار دن سے جاری چوہے بلی کے اس کھیل سے وہ اس قدر بھڑکے ہوئے تھے کہ کسی وقت اس پر دھاوا بول سکتے تھے مگر وہ ڈر رہے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر وہ بدک گئی تو کیا کرایا سب خاک میں مل جائے گا۔ آنکھ مچولی کا یہ سلسلہ بھی ختم ہوجائے گا۔ رگِ جاں پر گرتی ہوئی جذبات کی لذت آمیز پھوار سے بھی وہ محروم ہوجائیں گے۔

تو اب کیا کیا جائے؟ وہ سوچنے لگے۔ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈ نکالا جائے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

بات مطلب پر آگئی۔

انسان جب مطلب پرستی پر آجاتا ہے تو اس کے ذہن میں اچھے برے، جائز ناجائز سب طرح کے طور طریقے کروٹ لینے لگتے ہیں۔ جناب رحمت اللہ خاں بخاری نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں رشوت لینا تو درکنار، رشوت کو سونگھا بھی نہیں تھا۔ آج وہی رحمت اللہ خاں اپنی پوتی کو رشوت دینے کو تیار ہوگئے۔

وہ چپ چاپ بازار جاکر بڑی سی رقم خرچ کرکے، پوتی کے قد کی ایک ولایتی گڑیا خرید کر دبے پاؤں اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو حیران رہ گئے۔ ان کے لکھنے کی میز کی ہر چیز تتر بتر نظر آئی ______ قلم دان میں قلم ندارد۔ لکھنے کے کاغذ بکھر کر فرش پر پھیلے ہوئے تھے اور جس کتاب کو میز پر وہ کھلا رکھ کر گئے تھے وہ غائب تھی۔

وہ سمجھ گئے۔ ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر وہ ننھا چور دھما چوکڑی مچا کر فرار ہوگیا ہے۔ انھوں نے کواڑ کی جانب دیکھا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ کمرے میں نظریں گھمائیں۔ وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ البتہ، انھوں نے دیکھا، اس کے ٹیڈی بیر کو ان کے بستر پر قرینے سے لٹایا گیا تھا۔

بیٹھنے کے لیے انھوں نے revolvingchair کو اپنی طرف گھمایا۔ کرسی کا رخ ان کی طرف ہوا تو، چند لمحوں کے لیے وہ منجمد ہو گئے۔

اچھا تو آپ یہاں ہیں۔

ان کی گمشدہ کتاب گود میں لیے پوتی کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

ایک پل کے لیے ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ بوسوں کی بوچھار کرنے کا یہ اچھا موقعہ ہے۔ مگر دل نے کہا، نہیں ـــــــ خوابیدہ معصوم آنکھوں کو چونکا دینے کا حوصلہ وہ نہ کر سکے۔ وہ فرش پر بیٹھ گئے۔ تکتے رہے۔ ان موندھی ہوئی آنکھوں کو، جو نہ جانے کن خوابوں کے سفر میں تھیں۔

جانے کہاں سے ایک مکھی بھنبھناتی ہوئی اس کی ناک پر آ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ مکھی کو اس نے اڑایا۔ اس کی نظر سامنے بیٹھے گرانڈپا پر پڑی تو نیند بھی اڑ گئی۔

اس نے ڈرتے ہوئے کتاب میز پر رکھی۔ دھیرے سے کرسی سے اتری اور آہستہ سے کھسکنے کو تھی کہ اچانک اس نے اپنے ٹیڈی بیر کی جانب دیکھا۔ دوڑ کر ٹیڈی بیر کو اٹھایا اور باہر جانے کو آگے بڑھی کہ رحمت اللہ خاں کی شیریں آواز اس کے کانوں میں پڑی ـــــــ

دیکھو بیٹے، ہم آپ کے لیے کیا لائے ہیں؟

وہ رکی، مڑ کر دیکھا، رحمت اللہ خاں نے گڑیا والا ہاتھ آگے بڑھایا۔

یہ گڑیا لائے ہیں ہم، آپ کے لیے۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کیا کرے۔ آگے بڑھ کر گڑیا لے لے یا پیچھے پلٹ جائے۔

اس کی آنکھوں میں لالچ اترنے لگا۔

آو، آو، آو بیٹے۔ لے لو۔ ہم کچھ نہیں کریں گے۔

اس نے ٹیڈی بیر کو سینے سے لگالیا اور ڈرتے ڈرتے قدم بڑھائے۔ اس کی نظریں رحمت اللہ خاں کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ انکی نیت کا جائزہ لے رہی ہو۔

وہ پھر رک گئی، رحمت اللہ خاں کی جیسے سانس رک گئی۔ انہوں نے فوراً کہا ـــــــ

لو۔ ـــــــ ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

انھوں نے آنکھیں میچ لیں اور دل کی دھڑکنوں کو گنتے ہوئے اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ مگر یہاں بھی وہ مات کھا گئے۔ وہ چیل کی سی تیزی سے گڑیا ان کے ہاتھ سے نکال لے گئی۔ انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ تب تک تو وہ کواڑ کی آڑ میں پہنچ گئی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں خوف نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں شرارت سے مسکرا رہی تھیں۔

اس کی شرارت بھری آنکھوں کو دیکھ کر انکی حالت اس پیاسے جیسی ہوگئی، جو پانی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا سمندر کے کنارے پہنچ گیا ہو۔

بہر حال، اس چھوٹی سی رشوت سے انھیں ایک فائدہ ضرور ہوا کہ وہ اب دن میں گاہے بہ گاہے کواڑ کی آڑ سے نکل کر ان کے کمرے کا چکر لگانے لگی۔ کبھی کبھار وہ اپنے ٹیڈی بیر کو ان کے بستر پر لٹا کر اس سے باتیں کرتی رہتی۔ مگر یہ اسی وقت، جب اس کا بھائی کمرے میں موجود ہو۔ مگر رحمت اللہ خاں، اس کے بھائی، یعنی اپنے پوتے سے خوف کھانے لگے تھے۔ وہ اکثر ایسے سوال کرتا، جس کے جواب وہ دے نہیں پاتے تھے۔

ایک دن وہ اپنے والدین کے ساتھ بازار سے لوٹا اور ان کے کمرے میں آکر ایک سوال دے مارا ـــــــ

گرانڈپا، انڈین لوگ روڈ پر Spit کیوں کرتے ہیں؟

سوال سن کر وہ سٹپٹا گئے۔ مگر اسے ٹالنے کے خیال سے کہا ـــــــ کوئی گنوار جاہل رہا ہوگا۔

گنوار، جاہل means? ـــــــ

ان کلچرڈ۔

No grandpa Tht g oy was educated and well dressed ـــــــ وہ کچھ چبا رہا تھا

He spitted on the road like blood red spit you know.

کیا جواب دیتے وہ چپ ہو گئے۔
ویسے پوتی بھی سوال کرنے میں اپنے بھائی سے کم نہیں تھی۔ یہ بات اور ہے کہ وہ ان سے بات نہیں کرتی تھی، مگر ایک شام اس نے اپنی خاموشی کو توڑ ہی دیا______
مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ جا نماز لپیٹ رہے تھے کہ پوتی کا سوال ان کے کانوں سے ٹکرایا______
آپ Exercise کر رہے تھے گرانڈپا؟
انھوں نے مڑ کر دیکھا، پوتی ٹیڈی بیر کو تھامے، ٹانگیں ہلاتے ہوئے، ان کے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔
انھوں نے مسکراتے ہوئے جا نماز اٹھائی اور الماری کی جانب بڑھتے ہوئے کہا
ہاں بیٹے۔ ہم Exercise کر رہے تھے۔
What type of exercise is this grandpa?
وہ مسکراتے رہے۔
ہمارے پپّا اور ماما تو جوگنگ کرتے ہیں______
And They do jimcycling too.
بیٹے، وہ جو کرتے ہیں، وہ جوانی کی کسرت ہے اور ہم جو کرتے ہیں وہ بڑھاپے کی کسرت ہے۔ یہ کسرت کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے۔
اللہ۔ کون اللہ؟
جس نے ہم کو بنایا ہے۔ جو ہمیں کھانا دیتا ہے، پانی دیتا ہے، روشنی دیتا ہے______ سب کچھ دیتا ہے۔
سب کچھ دیتا ہے؟
ہاں۔
چوکلیٹ؟
وہ بھی دیتا ہے ______ اتنا کہہ کر ہنستے ہوئے انھوں نے باہیں

پھیلادیں، مگر وہ پھدک کر کواڑ کی آڑ میں ہولی۔ اور اپنی شرارت پر اتراتے ہوئے سوال کیا ــــــــ وہ کہاں رہتا ہے؟

انہیں وہ آسمان سے بھی زیادہ دور محسوس ہوئی۔

نہ جانے، اللہ کو خوش کرنے یا پھر رحمت اللہ خاں کی صحبت میں حاصل ہونے والی انجانی مسرت سے ہمکنار ہونے کے لیے، وہ اب ہر روز بلاناغہ نماز کے وقت ان کے کمرے میں حاضری دینے لگی۔

اس طرح وہ لاشعوری طور پر ان کے قریب ہوتی چلی گئی۔ مگر جہاں تک رحمت اللہ خاں کی اسے گلے لگانے کی کوشش کا سوال تھا، وہ نہایت چوکنی تھی۔

رحمت اللہ خاں نے جب بھی اسے بانہوں میں لینے کی کوشش کی، وہ اپنے آپ کو بچا کر نکل گئی اور ایسے موقعہ پر رحمت اللہ خاں کے چہرے پر کرب اور مایوسی کو دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوتی۔

ایک طرف وہ رحمت اللہ خاں کو بانہیں پھیلانے کے موقعے ڈھونڈتی رہتی، دوسری طرف رحمت اللہ خاں کے لیے درد ہی دوا بنتا چلا گیا۔

بچپن اور بڑھاپا، لاڈ اور ممتا کا کھیل کھیل رہے تھے۔

وقت گذرتا جارہا تھا۔

اس دوران بیٹے اور بہو نے بار بار رحمت اللہ خاں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اب یہاں کی تنہا زندگی کو ترک کرکے ان کے پاس امریکہ میں رہیں۔ مگر وہ کسی صورت میں ہندوستان چھوڑنے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوئے۔

تعطیلات ختم ہونے کو تھیں۔ بیٹے بہو کے کام پر لوٹنے کا دن قریب آرہا تھا۔ بیٹے نے مجبوراً واپس لوٹنے کا دن طے کرلیا۔

گھر لوٹنے کی بات کانوں میں پڑی تو بچوں کی امنگوں میں مدسا آگیا۔ اور رحمت اللہ خاں کو اسی بات نے جیسے ڈس لیا۔ ان کا ذہن سندھ پڑگیا۔ انھوں نے چپ سادھ لی۔ واپسی کی تیاری میں سب لوگ ایسے جٹ گئے کہ ان کی چپ کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

آخر کار وہ دن بھی آگیا۔ اس دن کے آتے ہی سب کے چہرے جذر سے متاثر ویران ساحل جیسے نظر آنے لگے۔ چند لمحوں کے فاصلے پر منظرِ جدائی کی گھڑی سے دوچار ہونے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ پھر بھی سب وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے جدائی کی جانب بڑھ رہے تھے۔

کار ایرپورٹ پر پہنچی۔ سب بے دلی سے نیچے اترے۔ بیٹے اور بہو نے سامان ٹرالی پر لاد کر چیکنگ کاؤنٹر کی جانب دھکیلنا شروع کر دیا۔ رحمت اللہ خاں بھاری قدموں سے ان کے پیچھے ہولیے۔ چلتے چلتے یک بیک انھوں نے کپکپی سی محسوس کی۔ انھوں نے دیکھا، پوتی اپنی نرم ہتھیلی میں ان کی انگلی تھام کر، ان کے ہمراہ چل رہی ہے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا، جیسے سانپ کے ڈسے پر، کسی سپیرے نے اپنے گرم ہونٹ رکھ دیے ہوں۔

نرم ہتھیلی کے لمس کی لذت کو اپنی رگ و پے میں سموتے ہوئے وہ شیشے کے اس دروازے کے قریب پہنچ گئے جہاں سے وہ ان کا استقبال کر کے گھر لے گئے تھے۔ آج انہیں یہیں سے الوداع کہنا ہوگا۔

یہ کیا تضاد ہے۔ یہیں ملے تھے۔ یہیں بچھڑنا ہوگا۔

وہ اس شفاف کانچ کے دروازے کو دیکھتے رہ گئے۔ مسافر دروازے پر پاسپورٹ اور ٹکٹ دکھا کر اندر جا رہے تھے۔

پوتی نے دادا کو دروازے کی طرف یوں گھورتے ہوئے دیکھا تو آہستہ سے ان کا ہاتھ چھو لیا۔

گرانڈپا۔

رحمت اللہ خاں نے پوتی کو اپنی جانب مائل دیکھا تو گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔

پوتی نے ان کی انگلی چھوڑ کر ٹیڈی بیر کو اس ہاتھ میں لیا۔

گرانڈپا، آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟

انھوں نے اس کی نیلی آنکھوں میں دیکھا، جہاں انہیں لاڈ اور پیار کا سمندر ہچکولے لیتا ہوا نظر آیا۔ انھیں محسوس ہوا۔ ان ہی نیلی گہرائیوں کے سہارے وہ اب

آخری گھڑیوں تک مسکراتے ہوئے زندگی کا سفر طے کر سکتے ہیں۔
ابھی تو وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو امریکہ جانے کو تیار کر رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا ـــــــ وہ چھوٹی نیلی آنکھیں آہستہ سے پھیل کر خدیجہ بیگم کی آنکھوں میں تبدیل ہورہی ہیں۔
وہ چونکے۔ لمحاتی تخیل کی گہرائیوں سے باہر آگئے۔ اور ہڑبڑاتے ہوئے کہا۔
بیٹے۔ ہم تمہاری گرانڈ ماں کو اکیلا چھوڑ کر کیسے آسکتے ہیں۔

Yes grandpa. She will feel lonely.

پوتی نے بھولے پن سے جواب دیا۔
کچھ لمحے دونوں ایک دوسرے کے عکس کو نظروں سے پیتے رہے، بیٹا اور بہو بھی سفر کی رسمی کارروائی سے فارغ ہوکر آگئے۔ ماں نے چلنے کے لیے بیٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

Grandpa You have this

اس نے ٹیڈی بیر رحمت اللہ خاں کی جانب بڑھایا۔
میں اسے کیا کروں گا بیٹے؟
آپ اس سے باتیں کیجئے گا۔ OK
رحمت اللہ خاں کی آنکھیں نم ہوآئیں۔ آواز بھاری ہوگئی۔ مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولے۔
ہاں ہاں صحیح ہے۔ میں بھول گیا تھا۔ میں اب کس سے باتیں کروں گا۔
انھوں نے ٹیڈی بیر اپنے ہاتھ میں لیا۔ ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ پوتی نے آگے بڑھ کر آہستہ سے ان کے گال پر بوسہ لیا۔
جذبات کا بندھ ٹوٹ گیا۔ ممتا بے لگام ہوکر بہہ نکلی۔
دھڑکنوں پر قابو پانے کے لیے انھوں نے پوتی کو سینے سے لگالیا۔ اور پھر اس کے رخساروں پر بوسوں کی بوچھار کردی۔

OO

ابھی نریندر مرا نہیں

وہ کسی بھی زہر سے ناواقف ہے۔ اس نے کبھی کسی زہر کو چکھا نہیں۔ کسی زہر کو سونگھا نہیں۔ اور نہ ہی کسی زہر کو دیکھا ہے۔

وہ تو ہر وقت دودھ کی باتیں کرتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا فلسفہ رہا ہے۔ اگر مرنے والا دودھ سے مرتا ہے، تو اسے زہر کیوں دیا جائے؟ ــــــ اور اپنی سمجھ میں سالا، آج تک یہ نہیں آیا کہ کوئی دودھ سے بھلا کیسے مر سکتا ہے؟ ایسا ہوتا تو انسان کب کا مر کھپ گیا ہوتا۔ کیونکہ انسان پیدا ہوتے ہی دودھ پیتا ہے۔ دنیا ہی ختم ہوگئی ہوتی۔ اور اللہ میاں اپنے میلے کے تنبو اکھاڑ کر کسی اور طرف نکل گیا ہوتا۔

مگر یہ ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ کہتا ہے۔ خرچ کتنا بھی ہو، کرو، پیسہ پانی کی طرح بہاؤ مگر، خون ــــــ نہیں۔ اس کی ایک بوند بھی نہیں بہنی چاہیے۔

یہ کیا بات ہوئی؟ مخالف کو راستے سے ہٹانا بھی ہے اور زہر اور چاقو کا استعمال بھی نہ ہو ــــــ یہ راستے کا کوئی ڈھیلا تھوڑا ہی ہے کہ اٹھایا اور ایک طرف پھینک دیا۔ وہ تو جیتا جاگتا انسان ہے۔ اس پر ستم یہ کہ گھر کا بھیدی ہے، وہ تو ماں کا ــــــ لھٹیا کھڑی کر دے گا۔

پر ہماری سنتا کون ہے؟ ہم نے کہا، جناب۔ آپ خون کی لالی سے گھبراتے ہیں تو ہم رام پوری کا استعمال نہیں کریں گے۔ اس بار زہر سے کام چلالیں گے۔

ویسے تو یہ زنانہ طریقہ ہمیں بالکل پسند نہیں ہے۔ پرانے زمانے میں راجے مہاراجے عورتوں سے یہ کام کرواتے تھے۔ مگر کیا کریں، صاحب سے ہمارے تعلقات ہی کچھ ایسے ہیں کہ ــــــــ

سچ پوچھو تو یہ سب آتما کی آواز کا نتیجہ ہے۔ آتما کی آواز، یہ ایک نئی بیماری ہے۔ یہ ان پرانے بوڑھے پولی ٹیشینس کو ہونے لگی ہے جن کی آتما کھنڈر ہو چکی ہے۔

ویسے ہمارے صاحب نہ تو پرانے ہیں، نہ بوڑھے۔ پھر بھی، جانے کیسے انھیں اس بیماری نے دبوچ لیا۔ دراصل انھوں نے پارٹی کی آواز نہیں سنی اور آتما کی آواز کا نعرہ بلند کیا، نتیجتاً ہائی کمانڈ نے چناؤ کے امیدواروں کی فہرست میں سے ان کا نام ایسے نکال دیا جیسے کوئی مرے ہوئے چوہے کو دم سے پکڑ کر باہر پھینک دیتا ہے۔ اخباروں میں ان کی جگہ پر ایک نئے نام، تازہ دم انڈسٹریالسٹ کا نام پارٹی امیدوار کی حیثیت سے چھپا تو ان کی سٹی گم ہو گئی۔ اپنی پرانی ساکھ کو مٹتے دیکھ کر، دھوتی کے لٹکتے ہوئے چھور کو مٹھی میں دبوچا، ٹوپی سنبھالی اور بھاگے، دلی کی طرف۔ وہاں کسی نے ان کی طرف دیکھنے تک کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ پھر بھی وہ پارٹی کے جانے مانے مداریوں کے سامنے جمورے کی طرح اوٹ پٹانگ کرتب دکھاتے رہے۔ مگر حاصل، لاحاصل رہا۔ دلی ان کے ہاتھ سے پھسل گئی تھی۔

ہاتھ سے دلی اور پیر تلے سے پارٹی کا پلیٹ فارم نکلتا دیکھا تو اڑتے ہوئے آئے، ہوائی جہاز سے۔ چمچوں کو جمع کیا۔ دوست احباب سے مشورے ہوئے۔ بحث و مباحثے ہوئے، پینترے رچے گئے مگر جب مایوس ہوئے تو مجھے بلوا بھیجا اور کہا۔ ــــــــ اس مخالفت کا کچھ علاج کرو۔

میں نے جیب سے رام پوری نکالا۔ اسپرنگ دبایا، سٹاک سے دھار والا حصہ باہر آیا۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ میں نے سمجھایا۔ آج کل سیاست میں اس کا چلن ہے۔

جیسے ہنجرے میں شیر چکر کاٹ رہا ہو، ویسے دیوان خانے میں گھومتے ہوئے وہ

برس پڑے ـــــ معلوم ہے، معلوم ہے، ہمیں سب کچھ.........

اسی لیے تو عرض کرتا ہوں، کہ آپ پر کوئی شک نہیں کرے گا۔

وہ رکے، میری آنکھوں میں دیکھا، ان کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ جیسے میری سوچ کا ایکس رے نکال رہے ہوں۔

میں انھیں سمجھانے آگے بڑھا، انھوں نے مجھے چاقو بند کرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے رام پوری جیب میں رکھ لیا۔ وہ قریب آئے، بولے ـــــ اب کہو کیا کہہ رہے تھے

دیکھیے، آج کل الیکشن لڑنے والا ہر شخص اپنے اطراف دوچار لٹھ باز رکھتا ہے، باڈی گارڈس رکھتا ہے۔ آپ آج بھی اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس لیے اس کارخانے دار کا کانٹا نکال دینے پر آپ پر کوئی شک نہیں کرے گا۔

اس نے آہ بھری، میری طرف دیکھا ـــــ مگر، سالا ہماری سنتا کون ہے۔

اماں یار، گھنٹے بھر سے تو میں سن ہی رہا ہوں۔ اب مارو نا گولی اپنے صاحب کو۔ پینے بیٹھے ہیں۔ آرام سے پیو۔ میں نے کہا۔

آپ نہیں سمجھیں گے اِزل صاحب۔ میں نے ان کے کیسے کیسے کام ایسی صفائی سے کیے ہیں کہ ـــــ

تم انھیں انڈیپنڈنٹ کینڈیڈیٹ کی حیثیت میں چناؤ لڑنے کو کیوں نہیں کہتے؟

سب کچھ کہہ کر دیکھ لیا۔ مگر ہماری سنتا کون ہے؟

آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟

وہ چاہتے ہیں، ماں کا.........

وہ آگے کچھ کہتے کہتے چونکا، جلدی سے نظریں گھما کر، سرگوشی کے انداز میں بولا ـــــ وہ چاہتے ہیں، کمبلا الیکشن پوسٹ پونڈ۔ حرام زادے، سالے جیسے دلی میں میرے باپ کا ہی دربار لگا ہوا ہے۔

اس نے ایک گھونٹ میں گلاس خالی کرکے، سگریٹ جلایا۔ میں نے اس کے

لیے دوسرا پیگ بنایا اور اب وہ اپنے صاحب کی باتیں دفنا دے گا۔ میں نے سوچا ـــــــ تم جب کچھ نہیں کر سکتے تو اتنا سر کیوں کھپا رہے ہو؟

آپ اتنی چھوٹی سی بات سمجھ نہیں سکتے تو کہانیاں کیسے لکھ لیتے ہیں؟"

میں سمجھ گیا۔ اب اس پر نشہ طاری ہونے لگا تھا اب وہ کہنے کی، نہیں کہنے کی سب باتیں بتائے گا۔ اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟ یہ نریندر آسمان سے ٹپکا ہے؟ یا بھگوان نے اسے گود لیا ہے۔ اسے بھی تو پاپوں کی جڑ اس پیٹ کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں۔ اور پھر یہ ماں کے ـــــــ سالے، الیکشن کے دنوں میں ہی ہاتھ لگتے ہیں۔ تبھی کچھ ڈینگ مار کر، کچھ خوف کا ہوّا کھڑا کرکے، کچھ چاقو دکھا کر، اپنا الو سیدھا کرنا پڑتا ہے۔ الیکشن کے بعد تو یہ بھڑوے، دلی میں اپنا الو سیدھا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

میں نے گھونٹ بھرنے کے لیے گلاس اٹھایا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

میں چلتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ کل نامزدگی کا آخری دن ہے۔

وہ چلا گیا۔ میں نے گلاس کو ہونٹوں سے لگایا۔ ہلکی سی چسکی لی۔ وہ چسکی، کتنی یادوں کو تازہ کر گئی۔

میری اس سے پہلی ملاقات تب ہوئی تھی جب وہ سائنس کالج کا طالب علم تھا۔ پروفیسر گنی رام کے دوستانہ اصرار پر میں کالج کے ڈرامے کی ہدایت کاری کے لیے وہاں گیا۔ گنی رام، انگلش کا پروفیسر تھا۔ اسے اردو نہیں آتی تھی۔ اس نے اپنے ہم پیالہ، ہم نوالہ شاگرد نریندر کو میرے حوالے کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ وہ تنظیم کاری کی مہارت رکھتا ہے۔ میں نے ڈرامے کے لیے ہیروئن کا انتظام کرنے کے لیے اس سے کہا، تو اس نے دوسرے دن کالج کی سب سے خوبصورت لڑکی کو میرے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔

ابتدائی ٹرائل کے بعد میں نے اس لڑکی کو ڈرامہ میں کردار دے دیا۔ ایسا کرکے میں نے عمر بھر کے لیے نریندر سے دشمنی مول لے لی۔

اس نے مجھ سے عمر بھر کے لیے دشمنی اس لیے نہیں ٹھان لی کہ اس کی

دلچسپی اس لڑکی میں تھی یا میں نے اس لڑکی میں دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ ہوئی کچھ یوں ہوئی۔۔۔۔۔۔

وہ بطورِ منتظم روزانہ ریہرسل میں آکر بیٹھتا تھا۔ ڈرامہ میں ایک کردار ایسا بھی تھا جسے ایک ہی مکالمہ ادا کرنا تھا اور وہ بھی ڈرامہ کا آخری مکالمہ تھا۔ میں نے وہ کردار ادا کرنے کے لیے اسے راضی کرلیا۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ اس مکالمے کی ادائیگی میں کامیاب نہ ہوسکا۔ بس، ہوگئی توہین اس کی۔ سبب میں تھا۔ نہ میں اسے وہ کردار ادا کرنے کے لیے کہتا۔ نہ اس خوبصورت لڑکی کے روبرو اس کی توہین ہوتی۔

اس کے بعد دو تین سال تک وہ نظر نہیں آیا۔

ایک بار میں یک بابی ڈرامہ کامپٹیشن کا جج مقرر کیا گیا تھا۔ دو اور حضرات بھی میرے ساتھ ججوں کے پینل میں تھے۔ تین ڈرامے ہم دیکھ چکے تھے۔ چوتھا شروع ہونے سے پہلے ڈرامہ کے نام کا اعلان ہوا۔ فن کاروں کے نام بتائے گئے اور آخر میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے جب نریندر کے نام کا اعلان ہوا تو میں چونکا۔ میرے کان کھڑے ہوگئے۔

میں نے ڈرامہ کو بڑے غور سے دیکھا۔ پرکھا۔ مقابلے کا نتیجہ نکلا تو ہدایت کاری کا انعام نریندر کے حصے میں آیا۔

دوسرے دن میں بار میں بیٹھا، شراب کا گھونٹ لینا چاہتا تھا کہ وہ مسکراتا ہوا بڑی خود اعتمادی اور فخر کے ساتھ آکر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں جانتا تھا سر آپ یہاں ہیں۔

میں مسکرا دیا۔

آج سنیچر ہے نا۔ آپ ہر سنیچر کو یہاں آتے ہیں، میں جانتا ہوں۔

میں خاموش رہا۔

میں یہ بھی جانتا تھا، آپ ڈرامہ کامپٹیشن کے جج بنائے گئے ہیں۔

میں نے سگریٹ جلا کر کش لیا۔

مجھے مبارکباد نہیں دیں گے؟

میں اس غیر متوقع سوال سے بوکھلا گیا۔ وہ میری بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملا کر مبارکباد دی۔

اس نے میرا شراب کا گلاس اٹھایا۔

To Narendra, The best director.

گلاس ہونٹوں سے لگا کر اس نے بڑا سا گھونٹ لیا۔ مجھے اس کی یہ حرکت ناگوار گذری، مگر میں ضبط کر گیا۔

اس رات وہ بہت دیر تک میرے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتے ہوئے باتیں کرتا رہا۔ کچھ سرفروشوں، کچھ شرابیوں سی۔

سر مجھے امید نہیں تھی

کس بات کی؟

مجھے انعام ملے گا۔

کیوں؟

آپ جج تھے نا۔ میں نے سوچا، آپ یقیناً میری ٹانگ کھینچیں گے۔

اس نے یہ بھی کہا تھا ______ کالج کے ڈرامہ کے اس واقعہ کے بعد اس نے مجھ سے عمر بھر کی دشمنی ٹھان لی تھی۔

اور کہا تھا ______ سر، حالانکہ میں آپ کو اپنا دشمن مانتا ہوں۔ میں دشمنوں سے کبھی کوئی رعایت نہیں برتتا، پھر بھی میں آپ کی عزت کرتا ہوں I respect you sir. کیونکہ اس کی ماں کا ______ میں آپ جیسا ڈائرکشن نہیں دے سکتا۔

آج اس انگوری جام کے آئینے میں دیکھتا ہوں تو اس کی شخصیت کا وہ اکھڑا پہلو صاف ابھر کر نظر آرہا ہے۔ اس نے ڈسٹرکٹیو ذہنیت سی بنالی ہے۔ اس کا قدرتی ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اس کے حصے کچھ بھی نہیں آتا، سوائے جھنجھلاہٹ اور دانت پیسنے کے۔ تب وہ کھسیانی بلی کی طرح کسی کی عزت یا کردار کے کھمبے نوچنے لگتا ہے۔ جس کی بدولت اس کے کردار میں ایسا کھردرا پن پیدا ہوگیا ہے کہ ہر شخص اس سے

کتراتا ہے۔ لوگوں کو کتراتے دیکھ کر وہ سمجھ بیٹھا ہے کہ سبھی اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ بہادر ہے، سورما ہے، در حقیقت وہ ایسا نہیں ہے۔ اس نے کبھی کسی کا قتل نہیں کیا، کبھی چاقو چلا کر کسی کو زخمی تک نہیں کیا۔ مگر قتل کے کئی افسانے اپنے نام جوڑ رکھے ہیں۔

انھیں دنوں، اس کی جان پہچان ایک ایم۔ ایل۔ اے سے ہوگئی ایم۔ ایل۔ اے کی سیاسی آنکھوں نے اس کے اندر فتنے خلق کرنے کی خوبی کو پہچان لیا اس نے نریندر کو اپنے گروہ میں شامل کر لیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد پارٹی کے علاقائی یوتھ ونگ کا سکریٹری مقرر کروا دیا۔

نریندر نے تھیٹر کو ترک تو نہیں کیا، مگر اس میں کوئی کارنامہ بھی سر انجام نہیں دے سکا۔ البتہ الیکشن کے دوران اس نے ایک کارنامہ ضرور انجام دیا، مگر اس کی خبر کسی کو ہونے نہیں دی۔

ایک دن، میرے ساتھ شراب پیتے ہوئے اس نے اپنا کارنامہ مجھے کچھ یوں سنایا ــــــــ

انل صاحب! بڑے مزے تھے ان دنوں، الیکشن کی گہما گہمی میں بڑی بھاگ دوڑ لگی رہتی تھی، صاحب ایم۔ پی کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے ایک جیپ اور ڈرائیور دے رکھا تھا۔ کچھ والنٹیر بھی دیے تھے۔ میں نے دو چار دنوں میں ہی انھیں دوسرے کاموں پر لگا کر تتر بتر کر دیا۔ اور اپنے ساتھ صرف دو لڑکیوں کو رکھ لیا۔ وہ دونوں کسی نچلی قوم کی تھیں اور دہاڑی پر والنٹیرس کا کام انجام دے رہی تھیں، وہ شراب کا گھونٹ لینے اور سگریٹ کا کش لینے کے بہانے ذہنی طور پر قصے کی جگالی کرنے کے لیے رکا۔

آپ کچھ بھی کہیے انل صاحب، ان نچلی قوم کی عورتوں کا جسم بڑا کسا کسا سا رہتا ہے۔ کولھوں پر ہاتھ مارو تو گرم دف کے مانند بج اٹھتے ہیں۔ اس جسمانی کساؤ اور پستانی اٹھاؤ کو دیکھ دیکھ کر، سالا اپنے ہاتھ میں بھی کھجلی ہونے لگی۔ بس ــــــ پھر کیا تھا، اس کی ماں ــــــ ایک دن، ایک گاؤں سے لوٹتے ہوئے ان کا باجا

بجا دیا۔ کردیا بیڑا غرق ہر بیچاری سالیوں کا۔

یہ سن کر میں سرد پڑگیا۔

دونوں کو ــــــــ ؟ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

ہاں۔ دونوں کی دف بجادی۔

میں نے خفا ہوتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں کہا ــــــــ تم نے ان کے مستقبل کے لیے کچھ نہیں سوچا؟

ارے، جس کے دماغ میں پورے ملک کے مستقبل کی فکر ہو، وہ بھلا دو چھوکریوں کی فکر کیا کرے گا۔

دو سال پہلے کہا ہوا اس کا یہ جملہ یاد آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں چونکا۔ اطراف میں دیکھا۔ مجھے یاد آیا، نریندر یہ کہہ کر چلا گیا ہے ــــــــ میں چلتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ کل نامزدگی کا آخری دن ہے۔

نہ جانے یہ کل کون سا نیا گل کھلائے گا!!

میں نے گلاس خالی کیا اور یہ سوچتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہوا کہ ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے پھر حالِ گلستاں کیا ہوگا۔

دو دن کے بعد، جب ایک مقامی اخبار میں میں نے نریندر کی تصویر ایک نئے سیاست داں کے ساتھ الیکشن کے داخلے کا فارم داخل کرتے وقت کی چھپی ہوئی دیکھی تو مجھے تعجب ہوا۔ تصویر کے ساتھ چھپی ہوئی خبر پڑھی تو مجھے یقین ہی نہیں ہوا، اس نے اپنے صاحب اور پارٹی سے رشتہ قطع کرنے کا اعلان کیا تھا۔

اس کا پارٹی سے رشتہ توڑنا، مجھے اتنا عجیب نہیں معلوم ہوا کیونکہ پارٹی کی اہمیت ان کے لیے ہوتی ہے، جن کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں، آدرش ہوتے ہیں۔ نریندر تو بن پتوار کی ناؤ جیسا ہے۔ ضرورت کے تھپیڑوں کے سہارے بہتے رہنے والا، مگر اس نے اپنے صاحب کے ساتھ ناطہ توڑ کر اچھا کیا یا برا، میں طے نہیں کرپایا۔

جیسے اخبار کی خبر کی عمر ایک دن کی ہوتی ہے، ویسے ہی نریندر کی یہ خبر دوسرے روز میرے ذہن سے اتر گئی۔ البتہ سنیچر کی شام کو بار میں شراب پیتے وقت

میرے ذہن میں اس کا خیال اڑتا ہوا آیا، اور پھر آیا گیا ہو گیا۔

دوسرے سنیچر کی شام کو میں بار میں پہنچا، تو نریندر پہلے سے وہاں موجود تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ وہ پہلے سے موجود ہو۔ اس نے میری جانب دیکھا۔ مسکرایا نہیں۔ میں اس کے روبرو پہنچا، اس نے بیٹھنے کا اشارہ تک نہیں کیا۔ میں بیٹھا۔ اس نے بات بھی نہیں کی۔ میں اس کے اس رویے پر مسکرایا اور اس سے پوچھا ـــــ کہاں ہو تم؟

جہنم میں۔

میں اس وقت کی بات نہیں کر رہا۔ اتنے دن کہاں تھے تم؟

ہسپتال میں۔

کیوں؟ کیا ہوا ہے؟

مجھے کچھ نہیں ہوا۔

ویٹر میرے لیے گلاس اور سوڈا رکھ کر چلا گیا۔ نریندر نے اپنا گلاس خالی کیا۔ دونوں گلاسوں میں جام تیار کیے۔ میں نے اپنا گلاس اٹھایا۔

کوئی بیمار ہے؟

ہاں ـــــ وہ کمینہ۔ سالا ـــــ

بات میری سمجھ میں نہیں آئی، اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھوں، اس نے کہا ـــــ میری جان بھنسار میں ہے، سور کی اولاد نے۔ تین لاکھ لے چکا ہوں اب تک۔

اس نے میری سوچ کو اور الجھا دیا۔ میں نے سوچ کی گتھی کو سلجھانے کے لیے ایک گھونٹ لیا ـــــ بھائی، صاف بات کرو تو کچھ سمجھ میں آئے۔

کیا صاف بات کروں، میرا خود کا بھیجا گتھم گتھا ہو گیا ہے۔ صاحب نے کہا، الیکشن پوسٹ پونڈ کروا دو، اور ہم اپنے آپ کو تیس مار خاں سمجھ بیٹھے۔

مگر تم نے تو صاحب سے رشتہ توڑ دیا ہے نا؟

نہیں سر، یہ سب ڈرامہ ہے۔ Gameof politics اس نے سگریٹ جلا کر کش کھینچا۔

اس رات کچھ کرنے کی سوچ کر یہاں سے نکلا۔ کوئی بات دماغ میں بیٹھ نہیں رہی تھی۔ سوچا، چلو ڈاکٹر اگروال کے پاس سے ہوتا چلوں کچھ نہیں تو نیند کی دو ایک گولیاں لے لوں گا۔ چین کی نیند تو سو سکوں گا

اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لی

ڈاکٹر کے گھر پر معلوم ہوا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ میں وہاں گیا۔ وہ ایک مریض کے علاج میں لگا ہوا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے رکا، پھر اس سے ملاقات ہوئی۔

میں نے اس سے پوچھا ——— کوئی ایمرجنسی کیس ہے کیا؟

کینسر پیشنٹ۔ مرنا نہیں چاہتا، علاج کے لیے پیسے نہیں ہیں، ڈاکٹر بیچارہ کیا کرے ——— اگروال نے جواب دیا۔

انل صاحب، اس کا جواب سن کر مجھے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ سچ پوچھیے نا تو اگروال کو تو قصائی ہونا چاہیے تھا۔ نصیب سے سالا ڈاکٹر بن بیٹھا۔

آج کل بھلا کون ڈاکٹر مفت میں علاج کرتا ہے ——— میں نے یونہی کہنے کو کہا۔

نہیں سر، یہ حرام زادہ اس سے بھی گیا گذرا ہے۔ مفت میں تو یہ کسی کی کٹی انگلی پر پیشاب بھی نہ کرے۔

میں اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ اس نے ماچس کی تیلی کان میں ڈالی۔ سر ذرا ٹیڑھا کیا اور کان کھجاتے ہوئے بولا ———

میں نے اگروال سے اس مریض کے بارے میں سب کچھ معلوم کرلیا۔ کیس کافی بگڑا ہوا تھا۔ علاج کروایا جائے، تو بھی مہینہ پندرہ روز کا مہمان تھا۔ میں نے مریض سے ہمدردی کے دو بول کہے، اسے اس کے گھر لے گیا۔ گھر میں صرف اس کی پتنی تھی۔ ہاں بچے تو تھے نہیں۔ رات وہیں رکا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کے علاج پر میں خرچ کروں گا۔ وہ اگر الیکشن کو ٹھہرے تو۔ میں اسے جتادوں گا۔ جس سے ضرورت پڑنے پر سرکار اسے امریکہ بھی علاج کے لیے بھیج سکتی ہے۔

بہر حال، سمجھا بجھا کر دونوں کو الیکشن کے لیے راضی کرلیا۔ دوسرے دن نامزدگی کا فورم بھر دیا۔ دیکھنے میں وہ بیمار نظر نہیں آتا تھا۔ دو دنوں کے بعد صاحب

سے ملا دو پے لیے۔ اس کا علاج شروع ہوا۔

اس نے کان سے تیلی نکال کر، اسے دیکھا۔ دور پھینکا۔ گلاس اٹھا کر ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ بولا ــــــــ پندرہ بیس ہزار اس کے علاج پر خرچ کیا۔ اتنا ہی اس کے الیکشن کے بینرز، پوسٹرس وغیرہ پر۔ اب تک تین لاکھ روپے صاحب سے اینٹھ چکا ہوں۔ صاحب شروع شروع میں دن میں ایک بار، پھر گھنٹے میں ایک بار، اور اب ایک ایک منٹ پر آدمی بھیج کر پوچھتے ہیں کہ کیا ہوا ــــــــ سالا مرنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ کل نہیں پرسوں وونٹگ ہے۔ اس سے پہلے اسے مرنا ہی ہوگا۔

میں نے محسوس کیا، جیسے میرے مسامات سے چیونٹیاں نکل کر پورے جسم پر رینگنے لگی ہیں۔ نریندر کہے جارہا تھا ــــــــ

اگر وال سے کہا، تو سالا کہتا ہے، مارنا جِلانا اوپر والے کے ہاتھ میں ہے، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ سالے کو، پیسوں کی ٹھوک لگائی تو پیشہ کے اصول کی بات کرنے لگا۔ کمینہ، انسان جب کوئی کام کرنے سے ڈرتا ہے تو کبیر کی طرح اصول کی چادر بُننے بیٹھ جاتا ہے۔

میں سمجھ گیا، نریندر پر اب شراب کا نشہ طاری ہورہا ہے۔ اس میں بھی پریشان شرابی کچھ زیادہ ہی بکواس کرتا ہے۔ میں اس کی بکواس سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ مجھے متلی محسوس ہو رہی تھی۔

قبل اس کے کہ وہ مجھ سے کچھ اور کہے، ایک آدمی اسے ڈھونڈتا ہوا آ پہنچا۔ اس نے نریندر کے کان میں کچھ کہا۔ نریندر نے کھڑے ہو کر اپنا گلاس خالی کیا۔

سر، میں چلتا ہوں۔

نریندر چلا گیا۔

واش بیسن پر جاکر میں نے قے کی۔ جیسے نریندر نے شراب نہیں زہر پلا دیا ہو۔

دوسرے دن، صبح سویرے میں چائے کے ساتھ اخبار کی گرم گرم سرخیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ نریندر آدھمکا۔

اخبار پڑھا جارہا ہے سر؟

ہاں مگر تم اس وقت؟

کل رات وہ مر گیا۔ کافی بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ لاش کو جلا کر اب گھر جارہا ہوں، سوچا آپ کو خبر سناتا چلوں، مگر اخبار میرے سے پہلے پہنچ گیا ہے آپ کے پاس۔

الیکشن ملتوی ہونے کی خبر پڑھی میں نے۔ مگر اس میں ایک خبر اور بھی ہے۔ میں نے اخبار کی سرخی دکھاتے ہوئے طنزاً کہا۔

اس نے اخبار میرے ہاتھ سے لے کر، سرخی کو بلند آواز میں پڑھا ——

وزیر اعظم نے کہا، کہ وہ جلد ہی پارلیمنٹ میں ایک بِل لے آئیں گے کہ آزاد امیدوار کی موت واقع ہونے پر چناؤ ملتوی نہیں کیا جائے گا۔

اس نے قہقہہ لگایا ——

اِنل صاحب ابھی نریندر مرا نہیں ——

○○

کریلا اور نیم چڑھا

سواری نے نیچے اتر کر کرایہ ادا کیا، کرائے کی رقم جیب میں رکھ کر اس نے ٹیکسی میٹر اوپر کی طرف گھمایا۔ تبھی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دفتر سے ہدایت سن کر اس نے بے دلی سے آگے سرکل پر ٹیکسی کو موڑا۔ اور دوان اوینیو (Dewan Avenue) جانے والی سڑک پر ہولیا۔

فون پر دوان اوینیو کا نام سنتے ہی اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ موڈ خراب اس لیے نہیں ہوا کہ وہاں کی سڑک خراب تھی۔ گلیاں تنگ تھیں، یا وہاں جانے میں کوئی خطرہ تھا۔ اس کا جی اس لیے اداس ہوگیا کہ جہاں جانے سے وہ ہمیشہ کتراتا ہے، آج ایک بار پھر اسے اسی راہ سے گذرنا ہوگا۔

ہر ملک، ہر شہر، ہر سڑک اور گلی محلہ کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے، اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ امریکہ کے شکاگو شہر کے دوان اوینیو کا بھی اپنا ماحول ہے اپنا مزاج ہے جو اپنی انفرادیت کی بدولت پورے امریکہ اور شکاگو شہر کے ماحول اور مزاج سے بالکل مختلف ہے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی، سال میں دو چار بار کسی سواری کو چھوڑنے یا کسی کو آج کی طرح لینے کے لیے وہاں جاکر اسے اس ماحول کو جھیلنا پڑتا تھا۔

اچاٹ من سے ٹیکسی چلاتے ہوئے وہ دوان اوینیو کے علاقے میں

داخل ہوا تو اس کی نظر سڑک کے کنارے، بجلی کے کھمبے پر لٹکے ہوئے بورڈ پر پڑی۔ بورڈ پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا ـــــ محمد علی جناح روڈ۔

بورڈ پر لکھے حروف کو پڑھ کر اس کی آنکھوں میں درد ایسے اتر آیا، جیسے چھت کے ٹوٹے ہوئے کھپریل سے برسات کا پانی دیوار پر اتر آیا ہو۔

سڑک پر لوگوں کی چہل پہل نہیں کے برابر تھی۔ اطراف کے مکان خاموش، اونگھتے سے نظر آ رہے تھے۔ اکثر مکانوں میں چھوٹے موٹے دفتر تھے۔ اندر کام کرنے والوں کے دماغ کی ہلچل، باہر سناٹا بن کر چھا رہی تھی۔

اس کے اطراف بھی سناٹا چھا گیا ـــــ اس کے ذہن پر نعروں کی گونج ابھرنے لگی۔

ہزاروں کا ہجوم ہاتھوں میں جھنڈے اور لاٹھیاں لیے ہوئے۔ لبوں پر ایک ہی سُر ایک ہی آواز۔ جس میں اس کی آواز بھی شامل تھی۔ سمندر کی دہاڑ میں بوند بھی گرج رہی تھی۔ اٹھی ہوئی آندھی میں، ذرّہ کی طرح زمین سے اٹھ کر وہ بھی حاکموں کے سر چڑھ کر بلند آواز میں بول رہا تھا ـــــ نعرہ ٔ تکبیر اللہ اکبر۔

ہجوم کا ہر شخص اپنے آپ کو ہجوم سمجھ رہا تھا۔

یک بیک سُر ٹوٹ گیا۔ آواز بکھر گئی۔ ہجوم تتر بتر ہونے لگا۔ بھیڑ میں بھگدڑ مچ گئی۔

گھڑ سوار پولس نے جلوس کو چاروں طرف سے گھیر کر لاٹھیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔ بھاگنے کے لیے اس نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ لاٹھی کے وار نے زلزلے کے مانند اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔

زلزلے سے گھبرا کر وہ نہاں خانہ ٔ دل سے باہر نکل آیا ـــــ

آستین سے چہرے کا پسینہ پونچھا۔ ٹیکسی کے اسٹیرنگ پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کی اور جلد از جلد اس ماحول سے چھٹکارہ پانے کے لیے، ٹیکسی کی رفتار

تیز کردی۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا۔ اس ماحول کی ہوا۔ سانسوں کے ذریعہ اس کے سینے میں پہنچ چکی تھی اور ماضی ذہن پر چھا چکا تھا۔

اس دن لاٹھی کی چوٹ نے اس کے حوصلے پست کرنے کے بجائے اور بلند کر دیے اس کے ارادے پختہ ہو گئے۔ اس کے ولولوں میں جوار سا آگیا۔ ہجوم اور جلوس کے بیچ میں چلنے والا۔ اب گولیوں اور لاٹھیوں کی پروا کیے بنا اولین قطار میں نظر آنے لگا۔

صف اول میں رہ کر نعرے لگانے سے وہ حاکموں کی نظروں میں تو کرچی کی طرح چبھنے لگا مگر لیڈروں کی آنکھوں میں سرمے کا کام کر گیا۔ انھوں نے اسے پلکوں پر بٹھا لیا۔

لیڈروں نے اسے سیاست کے سبق پڑھائے تو ملّاؤں نے جہاد کی بانگ اس کے کان میں پھونکی۔ بنگالی بابو جیسا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور پجامہ پہننے والے گبرو جوان کا کرتا کس گیا۔ پاجامے کے پائنچوں کا دائرہ کم ہو گیا۔ پاجامہ ٹخنوں تک سکڑ کر رہ گیا۔ ننگے سر پر جناح کیپ سائبان بن کر چھا گئی۔

اس نے والدین کی مرضی کے خلاف کالج کی تعلیم کو خیر باد کہہ کر۔ جھنڈا اٹھایا اور سڑک پر آکر نعرہ بلند کیا ———— نعرہ، تکبیر: اللہ اکبر ———— ہم لے کر رہیں گے پاکستان۔ پاکستان زندہ باد۔

لڑکے کو تعلیم چھوڑ کر۔ راستے پر نعرہ بازی کرتے دیکھ کر ماں باپ بوکھلا گئے۔ بیٹے کو بہت سمجھایا، گڑگڑائے مگر حاصل کچھ نہیں ہوا۔ کس سے کہتے! کیا کہتے! ہوا ہی ایسی چلی تھی۔ ہر گھر میں ایک دو ایسے سر پھرے موجود تھے۔ کوئی پاکستان کے نعرے لگا رہا تھا تو کوئی آزاد ہندوستان کی مانگ کر رہا تھا۔

جمہوریت کی مانگ۔ بٹوارے کے شور میں تبدیل ہو گئی تھی۔ فسادات کا بازار گرم تھا۔ پہلے ہندوستانی اور انگریز آمنے سامنے تھے۔ اب ہندو۔ مسلمان ایک دوسرے کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ منہ بولے رشتے رنگ بدل

رہے تھے۔ دوستی کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی تھی۔

لڑکے کو گھر میں بٹھانے کا اور کوئی راستہ ماں باپ کی سمجھ میں نہیں آیا، تو انھوں نے بزرگوں کا قدیم نسخہ آزماتے ہوئے، اس کے گلے میں مہندی رچے نازک ہاتھوں کی زنجیر ڈال دی ـــــــ مگر کہاں وہ مہندی رچے نازک ہاتھ اور کہاں مذہبی جامہ پہنے سیاسی جلوس۔ وہ ان بانہوں میں بھلا کیسے بندھا رہ سکتا تھا۔ ہاں، البتہ تھکے ہارے، زخمی شوہر کی مرہم پٹی کرتے کرتے ان ہاتھوں کی مہندی ضرور پھیکی پڑ گئی۔

اس نے زور سے بریک لگائی۔ ٹیکسی ڈگمگا کر رک سی گئی۔ ایک سکھ نوجوان چھلانگ لگاتا ہوا، راستہ کاٹ کر فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں موٹی سی گالی دی۔

اس کا پورا جسم پسینے سے تر بتر ہو گیا۔ اس نے ماضی کی یادوں کو سر سے جھٹک کر اپنی توجہ ٹیکسی چلانے کی جانب کر لی۔

ٹیکسی، صاف و شفاف راستہ پر پھسلنے لگی۔

کہتے ہیں ـــــــ ہر پچیس میل پر زبان کا لہجہ بدلتا ہے اور ہر راستے کے نکڑ سے راستے کا رنگ ڈھنگ بدل جاتا ہے۔

ٹیکسی کے سامنے کے شیشے میں سے اس نے دیکھا، قریب آ رہے چھوٹے سے سرکل کے اس طرف، راستے کا رنگ، ڈھنگ کچھ اور ہی تھا۔ اس نے ٹیکسی کی رفتار دھیمی کر لی۔

بیچ راہ میں، سرکل کیا تھا، جیسے کسی نے پھولوں سے سجا ہوا گلدستہ لا کر رکھ دیا ہو۔ سرکل کے بیچ میں دو تختیوں والا کھمبا صلیب کی مانند کھڑا کیا گیا تھا۔ جس طرف سے وہ آ رہا تھا، اس طرف کی تختی پر محمد علی جناح روڈ، اور جس طرف وہ جا رہا تھا، اس طرف کی تختی پر مہاتما گاندھی روڈ لکھا ہوا تھا۔

صلیب پر لٹکے مسیحاؤں نے اس خوبصورت راستے کا بٹوارہ کر رکھا تھا۔

گلدستہ نما سرکل کو پار کرکے ٹیکسی مہاتما گاندھی روڈ پر آئی تو اس کی رفتار اور کم ہوگئی۔ راستے پر لوگوں کی آمد و رفت زیادہ تھی۔ ہر شخص خرید و فروخت میں مصروف تھا۔ ایک ڈالر سے لے کر ہزاروں ڈالر کا سامان ہاتھوں ہاتھ بک رہا تھا۔ پاکستان یا ہندوستان کے بڑے شہر کے فٹ پاتھ کی طرح لوگ کندھے سے کندھا ملا کر مول تول کا لطف اٹھا رہے تھے۔ راستے کے دونوں طرف دکانوں کے شو روم نئی نویلی دلہن کی طرح سجے سجائے نظر آرہے تھے۔ دکانوں اور ریسٹوران کے بورڈ پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے تختے میں تاجر کا وطن، شہر یا گلی محلہ تخلص بن کر سما گیا ہے ـــــ "لاہوری کباب"۔ "انار کلی" اور "بھنڈی بازار" جیسے نام راہ چلنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔

"بھنڈی بازار" کا بورڈ اس کے لیے خاص کشش رکھتا تھا۔ وہاں سے گذرتے ہوئے وہ اسے پڑھے بغیر کبھی آگے جانہ پاتا۔ اسے پڑھتے ہی اس کے سینے میں ٹیس اٹھتی۔ جیسے اس کے کلیجے میں پھانس اٹکی ہوئی ہو۔ آج بھی اس نے بورڈ کے حروف پڑھے۔ اس کے سینے میں ٹیس اٹھی اور ماضی کے دھندلکے میں سوئی ہوئی یادیں دفعتاً جاگ گئیں۔

بٹوارے کا اعلان ہوچکا تھا۔ بھڑکانے اور اکسانے والے بیانوں کی سرخیوں سے اخبار لبریز ہورہے تھے۔ لوٹ کھسوٹ اور قتلِ عام کا بازار گرم تھا۔

اس کے لیے یہ فیصلہ کن گھڑی تھی، اسے فیصلہ کرنا تھا۔ وہ ہندوستان میں رہے گا یا پاکستان جائے گا!؟ ـــــ پاکستان کے لیے اس نے جدو جہد کی تھی۔ لاٹھیاں جھیلی تھیں۔ پاکستان یعنی دینِ الٰہی، نظامِ مصطفیٰؐ۔

ـــــ مگر پاکستان میں رہنا ہے تو اسے اپنا وطن بمبئی چھوڑنا ہوگا۔ یار برادروں سے بچھڑنا ہوگا۔ رشتے توڑنے ہوں گے۔ ہجرت کرنی ہوگی۔

ـــــ وہ پاکستان کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ وہ ہجرت کرے گا۔

اس نے ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اقلیت بن کر دوسروں کی غلامی نہیں کرے گا۔ وہ اکثریت کا جز بن کر اسلامی حقیقت میں سانس لے گا۔ جہاں کلمے کا نظام ہوگا۔

فیصلے کا اعلان سن کر اس کے والدین کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ والدہ پر غش کے دورے پڑنے لگے۔ بیوی کا حال تو اس کبوتر جیسا تھا۔ جس کو بلی نے دبوچ لیا ہو۔

والد کی زبان جب کھلی تو انھوں نے بہت ڈانٹا، پھٹکارا، لعنت ملامت کی۔ ہاتھ جوڑ کر اس حرکت سے باز آنے کو کہا۔ والدہ نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا۔ اس نے پچکارا، دلارا، اس دھرتی میں لیٹے اپنے بزرگوں کی قبروں کا واسطہ دیا اور بیوی نے تھرتھراتے ہوئے چپ سادھ لی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

آخر کار اس کی ہجرت کا وقت آگیا، گھر میں اتنا کچھ ہو چکا تھا کہ اب ہونے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ اتنا کچھ کہا اور سمجھایا جاچکا تھا کہ کہنے، سمجھانے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ باپ گردن لٹکائے ایک کونے میں اسٹول پر بیٹھ گیا۔ ماں سسکتے ہوئے ڈیوڑھی پر آکر رک گئی بیوی نے بچے کو کمر میں لیا، پوٹلی اٹھائی اور رسی سے بندھی گائے کی طرح شوہر کے پیچھے ہولی۔

وہ بیوی بچے کے ساتھ گلی میں ٹھہری وکٹوریہ میں سوار ہوا، کوچوان نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا۔ گھوڑا چل پڑا۔

وکٹوریہ کے چلتے ہی جسم و ذہن کا تناؤ ڈھیلا پڑا۔ اس نے کوچے کے مکانوں کو پیچھے چھوٹتے دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے۔ بچپن کو تو یہیں چھوڑے جا رہا ہے

اس نے سر کو جھٹکا دیا اور تن کر بیٹھ گیا۔

وکٹوریہ کوچے کا موڑ مڑی اور بھنڈی بازار کی بڑی سڑک پر آگئی۔ بھنڈی

بازار ابھی جاگا نہیں تھا۔ ویسے وہ اونگھ بھی نہیں رہا تھا۔ نیم خوابی کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔ اکا دکا لوگ فٹ پاتھ پر نظر آرہے تھے۔ دکانیں بند تھیں مگر ہوٹلوں کا کاروبار شروع ہو چکا تھا۔ تنگی سڑک پر گھوڑے کی ٹاپ تال بھرا ماحول پیدا کر رہی تھی۔ اس نے دیکھا۔ بادشاہی ہوٹل کے بغل کی پان بیڑی کی دکان، تکارام کھول چکا تھا اور بھگوان کی تصویر کو اگر بتی کا دھواں دے رہا تھا۔ وہ تکارام کی دکان سے ہی تمباکو خرید کر کھاتا تھا۔ اس کے جی میں آیا۔ آج آخری بار اپنا پسندیدہ تمباکو کھاکر، تکارام سے دعا سلام کر کے جائے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ خاموش بیٹھا فٹ پاتھ کو دیکھتا رہا۔

اس نے پیچھے سرکتے فٹ پاتھ کو دیکھا تو یاد آیا ـــــــ لڑکپن میں وہ بستہ اٹھاکر روزانہ اسی فٹ پاتھ پر سے گذرتا ہوا اسکول جایا کرتا تھا۔ اتوار کو کاندھے پر ہنومان کی گدا کی طرح بلا اٹھا کر اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کے لیے آزاد میدان بھی وہ اسی فٹ پاتھ پر سے چل کر آیا جایا کرتا تھا رمضان کے مہینے میں تو شام ہوتے ہی اس فٹ پاتھ کا دن نکلتا تھا۔ رات دیر گئے تک ان فٹ پاتھوں پر روشنی سے جگمگاتے۔ کھوے سے کھوا چھلتے ہوئے بازاروں میں وہ اور اس کے ساتھی دھما چوکڑی مچاتے گھوما کرتے ـــــــ

اس نے آہ بھر کر وکٹوریہ کی پشت پر پیٹھ ٹکادی اور آنکھیں بند کر لیں۔ وکٹوریہ کے ہلکے ہلکے ہچکولے۔ لوریاں سنانے لگے اور وہ خوابوں کو سہلانے لگا ـــــــ

ـــــــ کیا لوگ رہے ہوں گے وہ ؟ کیسے کیسے ظلم جھیلے ہوں گے انھوں نے کیسی کیسی دشواریوں کا سامنا کیا ہوگا؟ پندرہ سو سال پہلے، سرورِ دو عالم کے حکم پر جنھوں نے مکہ سے ہجرت کی تھی۔ صحرا کی تپتی ریت، انگارے برساتا آفتاب اور پیٹھ کے پیچھے جان کے دشمن کافروں کے قافلے ـــــــ

ـــــــ اور کیا رہے ہوں گے وہ لوگ ؟ کتنا اعلیٰ ایمان رہا ہوگا ان کا ؟

کیسا بلند پایہ کردار رہا ہوگا ان کا۔ جنھیں انصار بننے کا موقعہ عطا کیا گیا۔ جنھوں نے مہاجرین کو گلے لگایا۔ ان کی خدمت کی۔ انھیں اپنی ملکیت اور کاروبار میں سگے بھائیوں کی طرح حصہ دیا۔ انھیں اپنے قبیلوں میں جذب کرلیا ————

———— کیا حکم ربی سے وہ دور پھر ایک بار دہرایا جارہا ہے؟

توکیا مجھے یہ توفیق ————

ٹن۔ٹن۔ٹن ———— گھنٹی کے شور کے ساتھ، دھن دھناتے ہوئے ٹرام اس کی خلوت میں خلل ڈالتے ہوئے گذر گئی۔

پھر وہی گھوڑے کے ٹاپ کی آواز۔ بیوی اپنی چھاتی بچے کے منہ میں دے کر جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ————

اس نے ویسٹ تھرڈ ڈاؤن، سٹریٹ کے مکان نمبر 312 کے سامنے ٹیکسی کو روکا۔ ہاتھ کی گھڑی دیکھی۔ دس بج رہے تھے۔ وہ ٹھیک وقت پر پہنچا تھا مگر اسے یقین تھا۔ جس نے ٹیکسی بلوائی ہے وہ وقت پر نہیں آئے گا۔ ان پاکستانی اور ہندوستانیوں کا یہی تو رونا ہے۔ یہ کبھی وقت پر نہیں ہوتے۔ اگر کسی امریکن نے ٹیکسی بلوائی ہوتی تو وہ ابھی تک ٹیکسی میں بیٹھ چکا ہوتا۔ مگر اس علاقے میں کوئی امریکن ٹیکسی کیوں بلوائے گا۔ یہ شکاگو کی وہ آبادی ہے۔ جہاں پاکستانیوں اور ہندستانیوں نے اپنا ماحول خلق کر رکھا ہے۔ وقت بے وقت بچوں کی چیخ پکار، ٹیپ ریکارڈ پر بجتے فلمی گانوں کا شور فٹ پاتھ پر بکھرا کوڑا کرکٹ۔ راستے پر جگہ جگہ پیک کے نشان۔ کھڑکی اور بالکنی میں چمگادڑ کی طرح لٹکتے کپڑے۔ جو امریکن ماحول میں پیوند کی طرح ابھر کر نظر آرہے تھے۔

اس نے مکان نمبر 312 کے پھاٹک کی جانب دیکھا۔ وہاں اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے سر کی ٹوپی کو آگے کی طرف سرکا کر آنکھیں موند لیں اور ماضی کی جھیل میں غوطہ لگایا ————

کراچی پہنچنے کے کچھ ہی مہینوں میں اسے پاکستان اور خیالِ پاکستان میں

زمین آسمان کا فرق نظر آنے لگا۔

انھیں شہر کے باہر لگے کیمپوں میں سے ایک کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ حالات بہت ہی خراب تھے۔ سمندر کے راستے جو کراچی پہنچے تھے انھیں چھوڑ کر باقی سب مالی، جسمانی یا ذہنی طور پر لٹے ہوئے تھے۔ کیمپ میں پانی کا ٹھکانا تھا نہ سنڈاس، باتھ روم کا۔ کسی کو کوئی دھندا نہیں تھا۔ سب کے سب بے کار تھے۔ کوئی اپنی بربادی کی داستان سنا رہا ہے، تو کہیں بے فکر لونڈے گپ شپ کرتے بیٹھے ہیں۔ کوئی جوئے میں دلچسپی لے رہا ہے، تو کسی کی آنکھوں میں جنس کے سانپ رینگ رہے ہیں۔

وہ کچھ دن تو کسی انصار کے انتظار میں بیٹھا رہا جو اسے گلے لگا لے۔ اسے کلمے کے نظام کے دیدار کرادے۔ جو اس کی یادوں کے رِستے زخموں پر پھاہا رکھ دے۔ انتظار کرتے کرتے تھک ہار کر ٹوٹ گیا تو اس نے تپتی سڑک پر چلتے ہوئے شہر کا رخ کیا۔ اور انگارے برساتے آفتاب کو سر پر جھیلتے ہوئے کام کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔

کام کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے جب وہ کسی مقامی شخص کی آنکھوں کو دیکھتا تو اسے اپنی پیشانی پر مہر نظر آتی جیسے جانوروں کی پہچان کے لیے ان کے جسم پر گرم سلاخ سے مہر لگائی جاتی ہے، ویسے اس کی پیشانی پر مہاجر کی مہر لگا دی گئی تھی۔

مہاجر کا ٹھپہ دیکھتے ہی مقامی لوگ اسے حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگتے۔ جیسے وہ کوئی چور اچکا یا بھیک منگا ہو۔ یا اس کے جسم سے جذام ٹپک رہا ہو۔

معاش کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے ایک دن اسے پاؤں رکھنے کو زمین مل ہی گئی۔ ایک شخص مل ہی گیا، جس نے اسے چھوٹا موٹا کام دے دیا، وہ بھی مہاجر تھا۔ جوناگڑھ سے ہجرت کرکے آیا تھا۔ وہاں اس کا تیل کا تھوک کا کاروبار تھا۔

جسے لپیٹ سمیٹ کر وہ ہوائی جہاز سے کراچی پہنچا تھا اور کھلا پلا کر، یہاں سے بھاگے ہوئے ایک پچھی تاجر کی کوٹھی اپنے نام الاٹ کروالی تھی۔ اسے مقامی لوگوں پر قطعی بھروسہ نہیں تھا۔

حالانکہ یہ سب برادرانِ اسلام ہی تھے، کیا انصار کیا مہاجرین، ان سب کو بھائی چارے اور محبت کا ایک ہی مذہب گھٹی میں پلایا گیا تھا۔ مگر آج یہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی نفرت، حقارت اور بے اعتباری سے منہ پھیر لیتے تھے۔

انصار، پاکستان کو اپنی جاگیر سمجھتے تھے اور مہاجرین اپنا حق، وہ حق حاصل کرنے کے لیے ہی تو ہجرت کر کے یہاں آئے تھے، اس طرح ان کے درمیان سوتیلے پن کے انکور پھوٹ نکلے اور جب سوتیلے پن کی فصل تیار ہوگئی تو انسانی فطرت نے اکثریت اور اقلیت کے اطراف بربریت کا ننگا ناچ شروع کردیا۔ پھر ایسے شُعلے بھڑکے، ایسی لپٹیں اٹھیں کہ مذہبی محبت اور بھائی چارے کے بنیادی اصول ہی ان شعلوں کی لپیٹ میں آگئے، سوکھے کے ساتھ گیلا بھی جلنے لگا۔ صرف دو وقت کی روکھی سوکھی کی امید کرنے والے بھی آگ کی نذر کیے جانے لگے۔

ایک شام اس کی بیوی اور بچے اورنگی کے فٹ پاتھ پر سے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے کہ موٹر بائیک قریب سے گولیاں برساتے ہوئے تیزی سے گذر گئی۔ سات لوگ ہلاک ہوئے ان میں اس کی بیوی، دو بچے بھی شامل تھے۔

ٹیکسی کی کھڑکی پر ٹکی بانہہ کو کسی نے ہلکے سے چھوا۔ چونک کر اس نے ٹوپی چہرے سے ہٹائی۔ سواری کو دیکھ کر بٹن دبا کر دروازوں کا لاک کھول دیا۔ سامنے آئینے میں ٹوپی ٹھیک کرتے ہوئے اس نے دیکھا، ایک نوجوان جوڑا پیچھے کی سیٹ پر آکر بیٹھا ہے۔ آگے کا دروازہ کھلا اور اس کا ہم عمر بزرگ اس کی بغل میں آکر بیٹھ گیا۔ اس نے میٹر گھمایا۔

"سیئرس ٹاور" پیچھے سے عورت نے کہا۔

ٹیکسی چلنے لگی۔ سواریاں گھریلو باتوں میں لگ گئیں۔

وہ ماضی کی درد ناک یادوں میں کھویا ہوا ٹیکسی چلانے لگا۔

اس کی بیوی بچوں کے قتل کو تقریباً چالیس سال ہونے کو ہیں مگر وہ اس ہیبت ناک حادثے کو آج تک بھولا نہیں۔ وہ اپنی بیوی کو بہت چاہنے لگا تھا۔ اس کی بیوی اکثر اپنے ساس سُسر اور بمبئی کو یاد کر کے چھپ کر آنسو بہا لیا کرتی تھی، مگر کبھی ہندوستان واپس لوٹنے کی ضد کر کے اس کے اور اس کے خوابوں کے درمیان دیوار بننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ زندگی ایک ڈھرے پر آرہی تھی۔ وہ بھی دم توڑ چکے خوابوں پر نوحہ خوانی کرتے کرتے کچھ سنبھلنے لگا تھا کہ یہ سانحہ پیش آیا۔

ٹیکسی مہاتما گاندھی روڈ سے گذر رہی تھی۔ یادوں کی جلن کچھ سرد پڑنے لگی تھی۔ اس کے بغل میں بیٹھا ہوا بزرگ بازار کی رونق دیکھنے میں مشغول تھا۔

پاپا، وہ جو بڑی دکان آرہی ہے نا، اس کا نام "بھنڈی بازار" ہے۔ بزرگ نے بڑی دلچسپی سے اس گذرتی ہوئی دکان کے بورڈ کو پڑھ کر دکان کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

واہ، واہ اپنی مٹی سے محبت کی اس سے اچھی مثال اور کیا ہو سکتی ہے ـــــــ بزرگ نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس نام کو پڑھ کر ہمیں اپنی بمبئی کی یاد آجاتی ہے ـــــــ عورت نے جذباتیت سے کہا۔

بمبئی کا نام سنتے ہی اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے ان تینوں کی عارضی صحبت میں اپنے پن کی حرارت محسوس کی۔ محسوس کیا جیسے ٹیکسی میں بمبئی کی مہک پھیل گئی ہو۔ جیسے برسوں کے بعد کوئی اپنا گلے ملا ہو، جیسے جذبۂ محبت کی پھوار برس رہی ہو۔

مگر بمبئی اب رہنے کے قابل جگہ نہیں رہی ـــــــ آہ بھر کر بزرگ

نے جواب دیا۔

اس کے دل کو دھکا سا لگا۔

آئے دن وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ چھرے بازیاں ہوتی ہیں۔ گولیاں چلتی ہیں۔ بم پھٹتے ہیں۔ کئی سو سال پہلے کسی کے دادا پرداداؤں نے مندر گرائے تھے اب کسی کے پوتے پڑپوتے مسجد گراکے، سینائیں تیار کرکے اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں۔ گڑے مردے اکھاڑے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف اسمگلرس اس آگ کو ٹھنڈا ہونے نہیں دیتے۔ تشدد، وحشت اور اغوا کا ماحول ہو تو ان کا سونا، ڈرگس، بم ہتھیاروں کی ہیرا پھیری آسان ہوجاتی ہے۔

اس نے محسوس کیا جیسے یہ بزرگ اس کے گھر کے لٹنے کی تفصیلی روداد سنا رہے ہیں۔

بزرگ نے سلسلہ گفتگو جاری رکھا ——— لوگوں نے دھرم اور مذہب کے نام پر لڑنا، لوٹنا، مارنا سیکھ لیا ہے۔ دھرم اور مذہب کے نام پر جینا بھول گئے ہیں۔

اس کے حلق سے چیخ اٹھتے اٹھتے دب گئی۔

ٹیکسی میں خاموشی چھا گئی۔

سب چپ تھے۔

سب کے ذہنوں میں سوچوں کے بم پھٹ رہے تھے۔

سب ان دھماکوں کو دوسروں سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے باہر تاک جھانک کر رہے تھے۔

باہر ایک طرف آسمان کو چومتی ہوئی عمارتیں تھیں، تو دوسری جانب مچی گن (Michigan) جھیل کا خوبصورت کنارہ۔ تینوں مسافر باہر دیکھ رہے تھے مگر باہر کے نظاروں کا عکس کسی کے ذہن میں اتر نہیں رہا تھا۔ تینوں ذہنی اتھل پتھل میں مبتلا تھے اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اب کی بار اس کی بیوی بچے

بمبئی میں ہلاک کر دیے گئے ہیں۔

اس نے بغل میں بیٹھے بزرگ کی جانب دیکھا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا ــــــ جناب، آپ بمبئی سے آئے ہیں؟

ان تینوں کے چہرے حیرت اور خوشی سے کھل اٹھے۔ جیسے صحرا میں جو بسبز نظر آگیا ہو۔

پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی عورت نے خوشی سے آگے کی طرف جھک کر اس سے پوچھا ــــــ آپ انڈین ہیں؟

میں پاکستانی ہوں ــــــ چھوٹا سا جواب دے کر سامنے لگے آئینے میں دیکھا۔ آگے کی طرف جھکی ہوئی وہ عورت یکلخت پیچھے سرک گئی۔ جیسے اس کے ہاتھ پر بچھو نے ڈنک مارا ہو اس کا شگفتہ چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ آنکھوں میں دہشت طاری ہو گئی۔

عورت کے چہرے کے بدلتے رنگوں نے جیسے اس کے وجود کو حلال سے حرام کر دیا۔

اس نے ٹیکسی کو ایک گلی میں موڑا اور سیئرس ٹاور کے روبرو لاکر کھڑا کر دیا۔ عورت نے جھٹ سے دروازہ کھولا۔ ہسڑبڑا کر ٹیکسی سے اتری اور کانپتے ہوئے فٹ پاتھ پر جاکر ٹھہر گئی۔ اسکے شوہر نے جلدی سے کرایا ادا کیا اور اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا۔ بزرگ نے کھڑکی سے سیئرس ٹاور کی ایک سو دس منزلہ عمارت کی اونچائی کو ناپتے ہوئے اطمینان سے دروازہ کھولا۔

آپ بمبئی سے آئے ہیں نا؟ ــــــ اس نے بزرگ کو اکیلا دیکھ کر سوال کیا۔

بزرگ نے مڑ کر اپنے ہم عمر ٹیکسی ڈرائیور کی جانب دیکھا۔ تجسس نے اس کے چہرے کی جھریوں کو گہرا کر دیا تھا۔

ہاں ــــــ بزرگ نے سر ہلا کر دھیمے سے جواب دیا۔

دھیمے سر میں مٹھاس سے شرابور ہوکر اس نے دوسرا سوال داغا۔
ممبئی کیسی ہے؟
بزرگ نے محسوس کیا جیسے وہ اپنے والدین کی خیریت دریافت کررہا ہے۔
بزرگ کے چہرے پر پیار بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے جواب دیا
______ ممبئی اچھی ہے۔
اس چھوٹے سے جواب سے اس کی تشنگی اور بھڑک اٹھی۔ اس نے تڑپ کر پوچھا۔
"بھنڈی بازار؟"
اس کی دلگداز تڑپ سے متاثر ہوکر بزرگ کے ہونٹوں میں جنبش ہونے کو تھی کہ ان دونوں کے کانوں پر عورت کی بات ٹکرائی۔ وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔
"پاپا، وہاں ٹھہرے اس کے ساتھ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ انھوں نے سنا نہیں کہ وہ کون ہے۔ ایک تو مسلمان، اس پر پاکستانی۔"
اس کے چہرے کی جھرّیوں میں برق سی لہرا گئی۔
بیٹی کی نابالغانہ بات کو اَن سنی کرتے ہوئے بزرگ نے ٹیکسی کا دروازہ بند کیا، دروازے پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور نرمی سے دبا کر کہا۔
بھنڈی بازار، جس حال میں ہے، خوش ہے، بہت خوش ہے
لمس نے کرشمہ دکھایا۔
دونوں نے محسوس کیا، جیسے ان کی روحیں گلے مل رہی ہوں۔

○○

گونگی چیخ

رات کے تیسرے پہر خوف سے دبکی ہوئی بستی یک بہ یک اٹھ بیٹھی۔
بستی کا ہر چھوٹا بڑا، بوڑھا جوان، عورت مرد جو گہری نیند میں سونے کا ڈھونگ کر رہے تھے، یکلخت جاگ گئے۔ ہر جاگنے والے نے اپنے ہم بستر کو حیرت اور خوف سے دیکھا، جھٹ سے کھڑا ہوگیا۔ اور کھڑکی، دروازے یا دیواروں کی درازوں کی جانب لپکا۔ مگر لکھن کے چیخنے چلّانے کی آوازیں سن کر نہ تو کسی جھگی جھونپڑی کی روشنی نے آنکھیں کھولیں نہ بستی کے کسی در و دریچہ نے اپنے پٹ کھولے اور نہ کوئی مائی کا لال گلی میں آکر پولیس والوں سے یہ پوچھنے کا حوصلہ کرسکا کہ وہ لکھن کو کیوں مار رہے ہیں؟

جو چوری کرتے پکڑا جائے وہی چور ہوتا ہے۔ لکھن چوری کرتے ہوئے دھر لیا گیا تھا ویسے تو پوری بستی چور تھی۔ پچھلے چار دنوں سے بستی کا ہر شخص چوری کر رہا تھا۔ مگر پکڑا کوئی نہیں گیا۔ آج لکھن کو بھی پولیس والے نظر انداز کر جاتے مگر جیسے ہی گشتی دل کے دو جوانوں نے بستی میں قدم رکھا، ایک کا پاؤں گندگی میں پڑگیا۔ جوتے کے ساتھ ساتھ اس کا موڈ بھی خراب ہوگیا۔ اتنے میں اس کی نظر لکھن پر پڑی، جو اندھیرے میں اپنے گھر کے دروازے کی نالی پر لوٹا لیے گندگی پھیلاتا نظر آیا، بس ______ وہ جوان اپنا غصہ نکالنے کے لیے لکھن پر

جھپٹ پڑا۔

شہر میں پچھلے چار دنوں سے کرفیو لگا ہوا تھا۔ بستی کے گھروں میں سنڈاس تو تھے نہیں اور کرفیو میں سرکاری پاخانے تک جانے کا حکم نہیں تھا۔ اس لیے بستی والے رات کے اندھیرے میں دروازے سے ملحق نالی یا گلی کے کسی حصے کا چوری چھپے استعمال کر رہے تھے۔

گلی بھر کی آنکھیں جب درازوں سے لگی ہوئی تھیں، تب بہاری چٹائی پر لیٹے ہوئے لکھن کی چیخ پکار سے بے خبر اپنی جھونپڑی کی چھت کو تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مسلسل وہی منظر ابھر رہا تھا، اور وہ اسے جھیل رہا تھا۔

چار روز پہلے دوپہر کے وقت وہ اپنے گھر کے چبوترے پر، جو اس کی دکان بھی تھی ــــــ سلائی مشین پر گاہک کے کپڑے سی رہا تھا، اتنے میں ایک بڑی ٹیکسی اس کے سامنے آکر رکی۔ اس نے کام سے نظریں ہٹا کر دیکھا، ٹیکسی میں ڈرائیور کی بغل میں دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ پیچھے کی سیٹ خالی تھی۔ پیچھے کی سیٹ کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔

ٹیکسی کے رکتے ہی وہ دونوں اس کے پاس آئے۔ دونوں نے نمستے کیا، ایک نے پوچھا ــــــ بہاری تمہارا ہی نام ہے؟

جی، کہیے کا کام ہے؟

بہاری نے کندھے پر رکھی کپڑا ناپنے کی ٹیپ اتار کر مشین پر رکھتے ہوئے سوال کیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے جانب دیکھا۔ دونوں کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔

ایک بری خبر ہے۔

بُری خبر؟ ــــــ وہ اٹھتے ہوئے، اسٹول کو ہٹا کر چبوترے سے نیچے اتر آیا۔

کا خبر ہے؟

تمھارا بھائی ______

کا بھیا بمار ہوا کو؟

بہاری کا حلق سوکھ گیا، پاؤں کانپنے لگے۔

کچھ غنڈوں نے اس کا خون کردیا ہے۔

یہ سنتے ہی بہاری ریت کی دیوار کی مانند ڈھ گیا اور چبوترے پر بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ رونے کی آوازیں سن کر پہلے تو گلی سے پھر ساری بستی کے لوگ جمع ہوگئے۔ بستی کے لوگوں نے بڑی احتیاط سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ سے لاش کو نکال کر گھر میں لٹایا۔ لاش کا چہرہ اتنی بری طرح کچلا ہوا تھا کہ وہ انسان کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ کپڑے خون سے ایسے لت پت ہورہے تھے کہ ان کا اصلی رنگ اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا۔ لاش کے پاؤں میں نئی چپلیں تھیں۔ بہاری نے انھیں اتار لیا اور انہیں چومتے ہوئے بلک بلک کر رونے لگا۔

بہاری کو اس طرح چپل چوم کر روتے ہوئے دیکھ کر وہاں ٹھہرے ہر شخص کی پرنم آنکھیں حیرت سے اسے دیکھنے لگیں اور بہاری ہچکیاں لیتے ہوئے بولا ______

پچھلی مرتبہ بوا کہی رہین ______ ددا، اب کی تنخواہ پر ہم نئی چپل ______

بہاری پھر رونے لگا۔

بہاری کے ماتم کو دیکھ کر لاش لے آنے والوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ایک نے اشارۃً دوسرے کو جتایا کہ یہ کہاں مصیبت میں پھنس گئے، تو دوسرے نے اسے صبر سے کام لینے کا مشورہ دیتے ہوئے بہاری سے کہا ______

یہ چپلیں اس نے آج ہی خریدی ہیں۔ آج ہماری رات پالی تھا، صبح آکر

کہنے لگا، چلو بازار جائیں گے۔ مجھے چپل خریدنے ہیں۔

اتنا سنتے ہی بہاری چپل سے سر کو پیٹ کر سسکیاں لینے لگا۔

بہاری کا چھوٹا بھائی بلدیو، جسے پیار سے بہاری بُوا کہتا تھا، تین سال پہلے اپنی ماں کے انتقال کے بعد شہر چلا آیا تھا۔ سال ڈیڑھ سال چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد اسے کپڑے کی مل میں نوکری مل گئی۔ نوکری کے پہلے ہی روز اسے بڑے بھائی کا گھر چھوڑنا پڑا۔ بہاری کے گھر سے مل بہت دور تھی روزانہ وہاں سے کام پر جانا آنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے بلدیو نے مل میں کام کرنے والے اپنے ایک ساتھی کے کمرے میں آدھا کرایہ دے کر سانجھا کر لیا۔ ہفتہ پندرہ روز میں وہ بھائی، بھاوج اور بچوں سے آکر مل جاتا تھا۔ بہاری نے تو نہ جانے کتنے عرصے سے بستی کے باہر قدم ہی نہیں رکھا تھا۔ جب دیکھو مشین پر جھکا، کپڑے سیتا ہوا نظر آتا۔

لاش لانے والوں میں سے ایک نے اپنے ساتھی کے کان میں کانا پھوسی کے انداز میں کہا ——

سالا، یہ تو چُپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ جیسے مُردے کو پھر سے زندہ کر کے ہی دم لے گا۔

دوسرے نے جبراً بانہہ پکڑ کر بہاری کو لاش کے پاس سے اٹھایا، ایک طرف لے گیا اور دھیرے سے بولا ——

یہ رونا دھونا تو چلتا رہے گا، شہر میں کرفیو لگنے والا ہے۔ پہلے کفن اور لکڑی کا بندوبست کر، ورنہ مُردے کو کیا اپنے چُولہے میں جلائے گا؟

بہاری کا رونا تھم گیا، اسے اپنی مالی حیثیت کا خیال آگیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس نے رونے دھونے میں کافی وقت ضائع کر دیا ہے۔ اس نے انگوچھے سے آنکھیں پونچھیں کھلے ہوئے دھوتی کے سرے کو پیچھے کے حصے میں ٹھونسا اور کریا کرم کے لیے روپوں کا انتظام کرنے ننگے پاؤں گھر سے نکل گیا۔

بہاری مارا مارا بھٹکتا رہا۔ ہر جانے پہچانے در اور ہر دعا سلام کرنے والے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا مگر بوا کے لیے کفن اور لکڑی کا انتظام نہیں کرسکا۔ ایسے میں اچانک اس کے ذہن میں حاجی برکت علی کا چہرہ ابھرا۔ ایک مرتبہ اس نے حاجی صاحب کے پوتے کے اسکول کے کپڑے فوری طور پر سی دیے تھے۔ تب سے حاجی صاحب جب کبھی اس کی دکان کے سامنے سے گذرتے تو جھک کر سلام کرتا اور وہ اس کی خیریت پوچھ لیتے۔ اس نے سنا تھا حاجی سود پر روپے دینے کا کام بھی کرتے ہیں ۔ اس لیے اس نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ حاجی صاحب نے دروازہ کھولا تو اس نے جھک کر سلام کرنے کے بجائے ان کے قدموں میں بچھ گیا۔

یہ کیا! مجھے گناہ گار کیوں بناتے ہو میرے بھائی ــــــــ حاجی صاحب پیچھے ہٹتے ہوئے بولے۔ وہ اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ حاجی صاحب نے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تو بہاری نے اپنی رام کہانی سنائی اور ہاتھ جوڑ کر درخواست کی کہ اس کے بھائی کے داہ سنسکار کے لیے وہ کچھ روپے سود پر اسے ادھار دے دیں ۔ حاجی صاحب اس کی بات سن کر سنجیدہ ہو گئے۔ پھر کچھ لمحے سوچ کر دھیرے سے بولے ــــــــ

دیکھو میرے بھائی۔ ہمارے مذہب میں سود کا کاروبار حرام ہے۔ میں یہ گناہ بھلا کیسے کر سکتا ہوں۔ پانچ دس روپے کی بات ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ پانچ سات سو خیرات کرنے کی تو میری حیثیت نہیں ہے۔

مالک۔ اگر آپ بھی ایسا کہیں تو ہمار بوا کی لاش کا کا ہوئی؟

دیکھو میرے بھائی۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں ــــــــ سود پر روپے میں دے نہیں سکتا اور خالی ہاتھ تمہیں لوٹانے کو جی نہیں چاہتا۔ کوئی راستہ تو ڈھونڈنا ہی ہوگا۔

حاجی صاحب۔ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

کافی وقت گذر گیا تو بہاری پریشان ہونے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے بوا کی لاش دھیرے دھیرے سڑ رہی ہے، جس کی بدبو اس کی ناک میں گھسی چلی جارہی ہے۔

حاجی صاحب نے سوچتے سوچتے داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور متاثر کن لہجے میں بولے ـــــــ

واللہ، کیا خیال آیا ہے۔

حکم مالک ـــــــ بہاری نے جھٹ سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

دیکھو میرے بھائی، یوں کرتے ہیں میں تمہیں پانچ سو روپے دے دیتا ہوں۔

حاجی صاحب نے بہاری کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اٹھے، الماری سے اسٹامپ پیپر نکالا، اس پر کچھ لکھتے رہے، پھر کہا ـــــــ

یہ لو، ہم دونوں کی راحت کا نسخہ، پڑھ کر دستخط کردو، میں روپے لے کر آیا۔ بہاری نے ابھی چند سطریں ہی پڑھی تھیں کہ اس کے پیر تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ اتنے میں حاجی صاحب روپے لے کر داخل ہوئے۔ انھوں نے بہاری کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھیں تو مسکراتے ہوئے بولے ـــــــ

میرے بھائی، اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

مگر مالک، اس ماں آپ لکھین ہیں کہ ـــــــ

ہاں ہاں۔ میرے بھائی، ہم نے یہ ضرور لکھا ہے کہ تم نے اپنی سلائی مشین پانچ سو میں ہم کو بیچی ہے ـــــــ

وہی تو ہم کہت ہیں ـــــــ

رسماً ایسا لکھنا پڑتا ہے میرے بھائی۔ آگے ہم نے یہ بھی تو لکھا ہے کہ مشین تمہارے پاس رہے گی، جس کے عوض تمہیں روزانہ پانچ روپے نقد کرایہ دینا ہوگا اور جب تم روپے لوٹا دوگے تو ہم یہ کاغذ تمہارے سامنے پھاڑ کر

پھینک دیں گے۔

بہاری روپے لے کر گھر پہنچا۔ جب تک دو چار پڑوسیوں کو چھوڑ کر باقی ساری بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ بوا کے ساتھی جو لاش لے آئے تھے۔ یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ ان کا گھر بہت دور ہے۔ اسی لیے وہ رک نہیں سکتے۔

اس طرح جانے کب تک وہ ذہن میں گذرے ہوئے حادثے کی جگالی کرتا رہا۔ اس کی آنکھ تب کھلی جب پولیس کی جیپ صبح یہ اعلان کرتے ہوئے بستی سے گذری کہ آج صبح نو سے بارہ بجے تک کرفیو میں ڈھیل دی جا رہی ہے۔

کرفیو میں ڈھیل کا اعلان سنتے ہی بستی کی بے جان کوٹھریوں میں حرکت پیدا ہوگئی آٹھ بجتے بجتے ہی لوگ گلی میں نکل گئے اور افواہوں کی پتنگ اڑانے لگے۔ ہر کوئی فساد کے بارے میں اپنی جان کاری کو ترجیح دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگا ________ کیا گلی کے نکڑ اور چوراہے پر اور کیا سرکاری پاخانے کی قطار میں۔

سنی سنائی باتوں کا کہرا چھٹنے میں دیر نہ لگی۔ کچھ ہی دیر میں ہر کس و ناکس اپنے اپنے مسائل سلجھانے میں الجھ گیا۔ کسی کو دال اور آٹا جٹانا تھا تو کسی کو گیہوں اور چاول لانے تھے۔ کسی کے سر پر ہلدی مرچ کا بھوت سوار تھا اور کوئی چار دن کی بیڑی کا کوٹا محفوظ کرنے کے چکر میں تھا۔

بہاری نے اسنان کیا اور بوا کی استھی کی راکھ لانے شمشان کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب اس نے چھوٹی سی ہنڈیا میں راکھ لاکر جھونپڑی کی چھت کے بانس سے باندھ کر ہنڈیا کو لٹکایا تو اس کی پتنی رونے لگی۔ وہ بلکنے لگا۔ بچے بھی آنسو بہانے لگے۔ اس نے آنسو تب پونچھے جب پتنی نے اسے یاد دلایا کہ گھر میں پکانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے انگوچھا کندھے پر رکھا اور بے دلی سے بازار کی طرف چل پڑا۔

گلی کے نکڑ سے بازار جانے والے راستے پر جب وہ مڑا تو اس نے دیکھا

کہ سامنے سے آتی ہوئی جیپ رکی۔ جیپ میں بیٹھا ہوا حوالدار راستہ چلتے ہوئے کندن بڑھئی کو روک کر کچھ پوچھنے لگا۔ جواب میں کندن بڑھئی حوالدار کو کسی راہ کی سمت سمجھانے جا رہا تھا کہ اس نے بہاری کو دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے روک کر خصوصاً اس کی طرف اشارہ کر کے حوالدار سے کچھ کہا۔

جیپ تیزی سے اس کے پاس آئی۔ وہ کچھ سوچے سمجھے تب تک حوالدار نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ پس و پیش میں آگے بڑھا۔

بہاری تمہارا نام ہے ------؟ حوالدار نے سوال کیا۔

سوال سنتے ہی اس کے مسامات سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ اتنا گھبرا گیا کہ اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔ اس نے سر ہلا کر کہا ہاں!

تمھیں کوتوالی چلنا ہوگا۔

اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ اس کے سوچنے کی قوت کو جیسے فالج مار گیا۔ وہ حوالدار کے چہرے کو ایسے دیکھنے لگا جیسے قحط میں کسان آسمان کو تکتا ہے۔

اسے بیوقوف کی طرح اپنی طرف تکتا دیکھ کر حوالدار نیچے اترا۔ اس کی بانہہ تھام کر بولا ------ آؤ پیچھے بیٹھ جاؤ۔

بھیڑ جمع ہو گئی۔ اس کا جسم حوالدار کی ہاتھ کی پکڑ کے اشارے پر آگے بڑھا۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ سبھی سکتے میں آکر دیکھتے رہے۔ جیپ روانہ ہو گئی۔

کوتوالی پہنچتے ہی اسے انسپکٹر کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ اس نے ٹیبل پر ڈنڈا رکھا ہوا دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ آنکھ اٹھا کر انسپکٹر کو دیکھنے کی ہمت بھی اس میں نہیں رہی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر ڈنڈے پر نظریں جما کر ٹھہر گیا۔

تم بہاری ہو؟

جی حضور!

بہاری کی جھکی ہوئی آنکھوں نے دیکھا۔ انسپکٹر نے ایک ہاتھ میں ڈنڈے کو مضبوطی سے گرفت میں لے لیا۔ آنکھوں کے کناروں سے اس نے دیکھا۔ انسپکٹر

کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی ہڈیاں تڑختی ہوئی محسوس کیں۔ قبل اس کے کہ وہ ہنومان چالیسہ کا پاٹھ شروع کرے، انسپکٹر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی ______

ادھر آؤ میرے ساتھ۔

اس کی جھکی ہوئی آنکھوں نے دیکھا، انسپکٹر ڈنڈا لے کر مڑا اور اندر کی طرف چلنا شروع کیا۔ انسپکٹر کے پیچھے چلتے ہوئے اس نے نظریں اٹھا کر اس کی پیٹھ کو دیکھا۔ اونچا قد، بیت کی طرح لچکدار بدن، وردی میں اور بھی سخت جان نظر آیا۔

انسپکٹر ایک بند دروازہ کے سامنے رکا، جھٹ سے کنڈی ہٹائی اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی بدبو شعلے کی طرح لپکتے ہوئے اس کی ناک میں گھس گئی۔ اس نے انگوچھا اپنی ناک پر دبا لیا۔ انسپکٹر بدبو سے بے پروا آگے بڑھا۔ اس کی ہمت نہیں ہوئی، وہ رک گیا۔

انسپکٹر اس کمرے کے بیچوں بیچ رکا، مڑ کر دیکھا، اور بولا ______ یہاں آؤ۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ وہاں پہنچا تو دیکھا، کمرے کے دوسرے سرے پر دیوار کے قریب ایک شخص چادر اوڑھے، ہاتھ پاؤں پھیلائے اوندھا لیٹا ہوا تھا۔

انسپکٹر آگے بڑھا، اس سوئے ہوئے آدمی کے سرہانے جا ٹھہرا اور ڈنڈے سے اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے پاس پہنچا تو انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا ______

اسے پہچانتے ہو؟

انسپکٹر نے فوراً ڈنڈے سے اس آدمی کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

اس کی آنکھوں میں جیسے اندھیرا چھا گیا۔ وہ گرنے کو تھا کہ انسپکٹر نے اس

کی بانہہ تھام لی اور اسے کمرے سے باہر لے آیا۔
کچھ لمحوں کے بعد انسپکٹر نے نرمی سے پوچھا ——————
تم نے ٹھیک سے پہچانا اسے ؟
جی سرکار —————— اس نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔
یہ تمہارا بھائی بلدیو ہی ہے نا؟
جی۔
ٹھیک ہے۔ ہم آج اس کا پوسٹ مارٹم کروا کر رکھیں گے۔ کل اگر کرفیو میں ڈھیل دی جائے تو آکر لاش لے جانا۔
انسپکٹر اپنے کمرے میں چلا گیا۔
بے حس و بے جان اس کے جسم کو کوتوالی کے پھاٹک تک پہنچنے میں جانے کتنی دیر لگی۔ وہ پھاٹک پر پہنچا تب اخبار بیچنے والا بائیسکل پر اخبار کی سرخیاں پکارتے ہوئے گذرا ——————
چار روز پہلے عتور بھائی اسمگلر کا سرِ عام قتل ——————
قاتل لاش کو لے کر فرار ——————
شہر میں فساد ——————

OO

آرائش

ایک بار پھر اندھادھند کوشش شروع کردی۔ ہر سو ڈھونڈا، پورے صحرا کو کھنگال ڈالا۔ سانسیں اکھڑ گئیں۔ سر سے پاؤں تک مسامات میں گرم ریت کے ذرے بھر گئے۔ آنکھیں جھلس گئیں۔ مگر آبلہ، دست میں پھسلتی ہوئی ریت کے سوا، کچھ نہ آیا۔

______ وہ کیسے گرا؟

کہاں گرا؟

کب گرا؟

میں کچھ نہیں جانتی______

مجھے اس بات کا علم تب ہوا۔ جب اس روز ممی پاپا نے بلا کر اپنا ارادہ، اپنی انا کو مجھ پر لادنا چاہا۔

______ نہیں، ممی کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا، وہ تو سہمی ہوئی، خاموش بیٹھی سن رہی تھیں، جو پاپا کہہ رہے تھے۔ شاید پاپا نے انھیں پہلے ہی ڈانٹ پلا کر خاموش تماشائی بنا دیا تھا۔

پاپا سمجھتے کیوں نہیں کہ ان کی انا، میری انا کیسے بن سکتی ہے؟ ان کی سوچ میری سوچ کیسے ہو سکتی ہے؟ ان کی روح میرے جسم میں کیسے سما سکتی ہے؟

ایسے کئی باغیانہ خیال ذہن کے پردے پر بادلوں کی طرح ابھرے اور بکھر گئے۔ میں احتراماً خاموش کھڑی سنتی رہی۔

عورت کی خاموشی کو ہر بار اس کی رضامندی کیوں قرار دیا جاتا ہے!؟

میری خاموشی کا بھی یہی مطلب نکالا گیا۔

اداسی کے عالم میں، میں جب وہاں سے پلٹی تو اتفاقاً میرا ہاتھ ناک کی کیل کو سہلانے کے لیے اٹھا۔ کیل کو چھوتے ہی میں چونکی۔ دوڑتے ہوئے فوراً آئینے کے سامنے پہنچ گئی۔ ______ میرے چہرے کو منور کرنے والا وہ ہیرا ناک کی کیل میں نہیں تھا، میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مجھے میرا چہرہ سیاہ نظر آنے لگا۔ گھر صحرا میں تبدیل ہوتا ہوا دکھائی دیا اور میں نے بدحواس ہوکر ریت کو اچھال اچھال کر ہیرے کی تلاش شروع کردی۔

میں کسی حال، کسی صورت، کسی قیمت پر اس ہیرے کو پھر سے حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میں اس کے لیے کسی کی مدد بھی نہیں مانگ سکتی۔ پاپا سے کوئی امید نہیں۔ ممی تماش بین بنی بیٹھی ہیں۔ تعجب اس بات پر ہے کہ گھر میں کسی کو بھی میرے چہرے کا بدلا ہوا رنگ، ناک کی کیل کا سونا پن کیوں نظر نہیں آرہا!؟ ان کی نظروں کو کیا ہوگیا ہے؟

وہ ہیرا میری دادی نے چپکے سے مجھے دیا تھا۔ میں نہیں جانتی ان کو وہ کہاں سے ملا تھا، کس نے دیا تھا؟ البتہ انھوں نے اسے بڑی حفاظت اور جتن سے سنبھالا ہوگا۔ اسی لیے ان کے چہرے پر ہر وقت نور پھیلا رہتا تھا۔

گرما کی رات تھی۔ نوکر نے شام کو ہی چھڑکاؤ کر کے کوٹھے پر کھاٹ بچھادی تھی۔ میں دادی کی گود میں سر رکھ کر بے کنار آسمان میں یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے انگنت ستاروں کے ہجوم کو تک رہی تھی۔ ستاروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہنے کا اپنا ایک الگ لطف ہے، دادی اپنا ماضی مجھے سناتے ہوئے، اپنے بیتے دنوں کو پھر سے جی رہی تھیں۔ میں دادی کی باتوں سے بے نیاز، وہ میرے وجود

سے بے خبر۔ ایک عجیب تنہائی کا سماں بندھا ہوا تھا۔

تھپکیاں دیتے ہوئے دادی کے ہاتھ نے اچانک میرے سینے پر ہلکے سے ابھار کو محسوس کیا۔ ان کا ہاتھ رک گیا۔ انگلیوں نے نرمی سے ابھار کو ٹٹولا اور شاید محسوس کیا کہ اب میری عمر بیتے دنوں کے قصے سننے کی نہیں رہی، انھوں نے گفتگو کا موضوع بدلا، وہ قصہ سے کہانی پر آگئیں۔

اس رات انھوں نے سیتا کی کہانی سنائی، دوسری رات ساوتری کی، پھر دمینتی، دروپدی کی اس طرح کچھ ہی دنوں میں ڈھیر لگا دیا کہانیوں کا۔

ہر دادی اور نانی کی طرح ان کا بھی کہانی سنانے کا انداز بڑا مرغوب تھا۔ ان کے انداز نے مجھے ایسا لبھایا کہ میں ان کہانیوں کے کرداروں کو اپنی سکھی سہیلی سمجھنے لگی۔ ان کرداروں کے طرزِ زندگی سے میں اتنی متاثر ہوئی کہ بڑی ہوکر ان کے نقشِ قدم پر چلنے کے، زندگی جینے کے خواب بننے لگی۔

تھوڑے ہی دن تو میں ان کے ساتھ رہی ہوں، لیکن دادی نے کہانیاں سناتے ہوئے کب وہ ہیرا میرے دامن میں ڈال دیا، مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔

نہ پانے کا علم، نہ کھونے کی خبر، حیرت ہوتی ہے مجھے اپنی نادانی پر۔

حیرت تو مجھے اس دن بھی ہوئی تھی جب ممی نے مجھے سینے سے لگالیا تھا۔ میری ممی جو بہتے خون کی بات سن کر غش کھا جاتی ہے، اس نے جب میرے جسم سے خون بہنے کی بات سنی تو مجھے سینے سے لگا کر، بالوں کو سہلاتے ہوئے، میری پیشانی کو چوما تھا، جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو، ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ مگر میں نے ان کی آنکھوں میں ڈر کا ہلکا سا سایہ بھی دیکھا تھا۔ جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

دیواروں کے صرف کان ہی نہیں ہوتے، آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔ گھر کی دیواروں نے ممی کی آنکھوں میں پھیلے ہلکے سے ڈر کو پڑھا اور گھر کے بزرگوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ جیسے دور سے آتے ہوئے فائر بریگیڈ کی گھنٹی کی آواز انھوں

نے سن لی ہو۔

دوسری طرف می نے اپنی آنکھوں میں اترے ڈر کے سائے کو زمانے کی نظروں سے چھپانے کے لیے جیسے کمر کس لی۔ ساڑھی کا پلو کمر میں ٹھونسا۔ مجھے غسل خانے میں لے گئیں اور میرے جسم سے بہتے خون کا راز منکشف کرتے ہوئے یوں سمجھانے لگیں، جیسے میرے کان میں منتر پھونک رہی ہوں کہ ——

—— بیٹی، مرد کے جسم سے بہنے والا خون جنگ اور نفرت کو پیدا کرتا ہے۔ عورت کے جسم کا بہتا خون انسان اور ممتا کو جنم دیتا ہے۔

منتر پھونکتے پھونکتے می نے کب دادی کے ہیرے کو کیل میں جڑ کر میری ناک میں نکیل ڈال دی، میں جان بھی نہ پائی۔

غسل خانے سے باہر آتے آتے میں نے اپنے آپ کو اپنی عمر سے بڑا محسوس کیا۔ میرے پاؤں کی تھرکن جیسے غائب ہوگئی۔ ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرنے والا میرا جسم، ہولے ہولے قدم رکھنے لگا۔ میری ہنسی، میرے قہقہے، دبی دبی مسکراہٹ اور حیا میں تبدیل ہوگئے۔

اس معجزے کو صرف میں نے ہی نہیں جھیلا، پاپا اور ممی بھی اس کا شکار ہوئے۔

میرے ساتھ ان کا برتاؤ ہی بدل گیا۔ پاپا جو لاڈ سے مجھے اپنی گود میں بٹھا کر چوما کرتے تھے، اب مجھے چھونے کو بھی جھجکنے لگے۔ پہلے ڈانٹ پھٹکار دیتے تھے۔ اب نرمی سے پیش آنے لگے۔ ان کی آواز میں پیار سے زیادہ رحم کی خنکی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر قبر میں پیر لٹکائے ہوئے مریض سے باتیں کر رہا ہے۔ ممی تو جیسے چوبیسوں گھنٹے مجھ پر نظروں کا پہرہ لگائے بیٹھی رہتیں۔ اور وقت بے وقت نصیحت کرنے لگ جاتیں —— مجھے کیسے بیٹھنا چاہئے، کیسے چلنا چاہئے کیسے اوڑھنا پہننا چاہئے۔

میرے اطراف پابندیوں کا گھیرا گھڑا کر دیا گیا۔ ممی اور پاپا کے اس روپ کا

میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ ذرا کی ذرا میں رشتے بدل گئے۔ لاڈ پیار، ممتا کے چشمے ایسے سوکھ گئے جیسے دھوپ نکلتے ہی اوس کے قطرے خشک ہوجاتے ہیں۔

ان کے بدلے ہوئے سلوک سے مایوس ہوکر میں نے رفتہ رفتہ گوشہ نشینی اختیار کرلی۔

میری گوشہ نشینی سے نہ جانے گھر کے لوگوں نے کیا سوچا، گھر میں سرد جنگ چھڑ گئی۔ گھر دو پارٹیوں میں بٹ گیا۔ گھر کے سب لوگ ایک طرف، تو دوسری طرف پاپا اکیلے، سب چاہتے تھے کہ اچھا لڑکا ڈھونڈ کر میری شادی کردی جائے۔ پاپا اس بات کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا، میں ابھی کمسن ہوں، مجھے پڑھنے دیا جائے۔

میری تعلیم جاری رہی، مگر میرا جی اب پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ اسکول سے آتے ہی کتاب لے کر کسی کونے میں جا بیٹھتی، کتاب میں منہ چھپائے کبھی سیتا سے باتیں کرتی، تو کبھی دروپدی سے، کبھی ساوتری کے سنگ گپ شپ ہوتی۔

گرتے سنبھلتے میں نے بی۔اے کرلیا، ان برسوں میں میرا قد، کاٹھی بھی اچھی نکل آئے تھے، پاپا کے پاس بھی اب کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ ممی بھی ہاتھ دھوکر ان کے پیچھے پڑی تھیں۔ اس لیے پاپا جٹ گئے میرے لیے لڑکا ڈھونڈنے میں۔

لڑکوں کا کون سا قحط ہے۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ میرے لیے بھی مل گیا۔ سب کو پسند آیا، ہم نے بھی ایک دوسرے کو پسند کیا، عام آدمی جتنا شادی بیاہ پر خرچ کرتا ہے، اتنا پاپا نے ہماری منگنی پر لٹایا، ممی بہت خوش تھیں۔ انھوں نے میری نکیل کی رسی ڈھیلی کردی۔ پہرے اٹھالیے، پابندیاں ہٹالیں۔ میں قلانچے بھرنے لگی۔ پہلے کی چوکڑی اور اب کے قلانچے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کبھی ہاتھ میں ہاتھ لیے، کبھی بانہوں میں بانہیں ڈالے، دو جسم مس ہوتے ہوئے، آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے۔

مگر سچ کہا ہے کہنے والوں نے ـــــــــــ آسمان کی بلندیوں کو چھونے والے زمین پر گرتے ہیں۔ مستقبل کا پیکر جو میں نے بنایا تھا وہ چکنا چور ہوگیا۔ اپنے ساس سسر کی خدمت کے جو منصوبے بنائے تھے، وہ ریت کے محل کی مانند ڈھے گئے۔ زندگی کی جن راہوں پر ہمسفر کے شانہ بشانہ چلنے کا عہد کیا تھا وہ راستے ہی میں انا کی باڑھ میں بہہ گیا۔

یہ سب صرف اس لیے ہوا کہ ان کے خاندان کے کسی شخص نے ہمارے خاندان کے کسی فرد سے کہہ دیا کہ آپ نے منگنی کی رسم میں دکھاوے کے لیے خرچ تو کافی کیا ہے، مگر لڑکے کو صرف آدھے تولے کی انگوٹھی پر ٹرخا دیا۔

بس، پاپا بپھر گئے، ان کی انا گرجنے لگی۔

دو سانڈ ٹکراتے ہیں، تو بے چارے پودے کچلے جاتے ہیں۔

پاپا نے میرے لیے کئی حکم جاری کردیے ـــــــــــ اس سے ملنا جلنا بند، فون پر بات کرنا بند۔ خط و کتابت بند ـــــــــــ

ان پر سب دروازے بند کر دیے گئے۔

پاپا کے حکم میں اور ممی کی پابندیوں میں بہت فرق تھا۔ ممی کی ممتا کو لانگھا جاسکتا تھا۔ پاپا کی انا سے مفر ممکن نہیں تھا۔

چند روز پہلے جس خاندان سے رشتہ جوڑ کر فخر محسوس کیا جارہا تھا۔ اب اس میں نقص نکالے اور عیب دیکھے جارہے تھے۔ گھر کا ہونے والا داماد برے القاب سے نوازا جانے لگا۔

لڑکی والوں کو اینٹھتا دیکھ کر، لڑکے والے اکڑ گئے۔ چند دن گذرے تو رشتہ مردہ جانور کے جسم کی طرح پھول کر سخت ہوگیا۔ اور اس سے اٹھنے والی بدبو سے اس کے اطراف باتوں کے گدھ منڈلانے لگے۔

کچھ لوگوں نے پاپا کو سمجھایا، وہ نہیں مانے۔ ایک دن انھوں نے سمدھی سے ترکِ تعلقات کا اعلان کر دیا۔

میں خوب روئی۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ اشکوں سے تر رخساروں کو پونچھا تو دوپٹے کی گوٹ ناک کی کیل میں پھنس گئی۔ درد کے مارے میں تڑپ اٹھی مگر دوسرے لمحے ہی خوشی سے اچھلنے کو دل مچلا۔ میری باچھیں کھل گئیں۔ چہرے پر تبسم کے انار پھوٹ پڑے۔

مجھے پتہ چل گیا۔ معلوم ہوگیا۔ میں جان گئی۔ میرا آبدار ہیرا۔ دادی کے ارمانوں کا ہیرا۔ سیتا، ساوتری، اور دروپدی کے ورثے کا ہیرا۔ کب، کہاں اور کیسے گم ہوا۔

اس روز ڈھلتی شام کو وہ آئے۔ صبح سے ہی میں محسوس کر رہی تھی کہ آج وہ ضرور آئیں گے۔ شام ہی سے میں گنگنانے لگی تھی۔ بننے سنورنے کے لیے آئینے کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ ان کو آتا ہوا دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔

ہمارے ساتھ چلو گی؟ ــــــ میری جانب بڑھتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔

میں نے دوپٹہ اٹھا کر سینے پر پھیلا دیا اور ان کے ساتھ جانے کے لیے آگے بڑھی۔

پوچھو گی نہیں؟ میں کہاں لے جانے آیا ہوں۔

آپ بنواس چلنے کہیں گے، میں پیچھے پیچھے چلی آؤں گی۔

چند لحظے مجھے یوں دیکھا کیے جیسے میرے وجود کو اپنی آنکھوں میں سمو لیں گے۔ پھر میرے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں ایسے لیا، جیسے پوجا کے لیے ناریل کو لیا جاتا ہے۔ ان کی آنکھوں سے پیار برسنے لگا۔ اس میں شرابور ہوکر میں نے کپکپی محسوس کی۔ جسم حیا کی گٹھری کی طرح سکڑ گیا ان کی گرم سانس، میری پیشانی پر پھسل کر دھیرے دھیرے نیچے کی طرف اترنے لگی۔ سانسوں کی نمی میرے ہونٹوں تک آئی۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ دل ڈھولک کی تھاپ کی طرح بج اٹھا۔ شرم سے پانی پانی ہوکر میں نے اپنا چہرہ ان کے سینے میں چھپا لیا۔

سکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے ابھی چند لمحے ہی گذرے تھے کہ نیچے سے ممی نے آواز دی۔ میں نے ہڑبڑا کر سر ان کے سینے سے ہٹایا تو ناک کی کیل سوئیٹر کے تاگے میں اٹک گئی مارے درد کے میں تڑپ اٹھی ــــــ

مجھے یقین ہے اس وقت میرا وہ آبدار ہیرا کیل سے نکل کر ان کے سویٹر کی کشیدہ کاری میں کہیں اٹک گیا ——

میں نے طے کر لیا، کہ میں دادی سے ورثے میں ملا آبدار ہیرا ان سے واپس لے آؤں گی —— مگر میں کتنی نادان تھی۔ اتنا بھی نہ جانا کہ آسمان سے گرا ہوا ستارہ لے کے آسمان میں ٹانکا نہیں جاسکتا۔

میری کیل سے گرا ہوا ہیرا مجھے واپس مل بھی جائے تو اب وہ آب اس میں قائم نہیں رہے گی۔ انھیں اپنا سب کچھ مان کر وہ آب تو میں نے خود ان کی نذر کر دی تھی۔

کسی کو نذر کی ہوئی عقیدت واپس کیسے لی جائے؟

میرے ہونٹوں پر آباد ان کی سانسوں کی تراوٹ کو کیسے لوٹایا جائے؟

والدین تو رشتے کی خاک کو جھٹک کر الگ ہو گئے۔ میں ان کی بانہوں کے لمس کو جھٹک کر کیسے پاک صاف ہو پاؤں گی۔ میں سیتا، ساوتری اور دروپدی کی دوستی کو کیسے نبھا پاؤں گی۔

میں نے فیصلہ کر لیا —— میں ان سے جا کر کہوں گی ——

چلو ہم کسی مندر میں جا کر شادی کر لیں۔ میرے ہیرے پر لگی گرد کو صاف کر کے اسے اور آبدار بنا دیں۔

میں فوراً ان کے گھر جانے کے لیے مڑی۔ مڑتے ہی میں حیران رہ گئی۔ جیسے میرے پیر زمین سے چپک گئے ہوں۔ دروازے میں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا دروازے میں پاپا چٹان کی طرح باہر سے آتی ہوئی روشنی کو روکے ٹھہرے تھے۔

قبل اس کے کہ دل سے حوصلہ پا کر میں قدم آگے بڑھاؤں۔ میرے کانوں سے پاپا کی آواز ٹکرائی —— تم تیار ہو جاؤ، تمہیں دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔

OO

سانسیں اپنی قبروں میں

پہلے کبھی اسے رات کی تاریکی میں یوں دیدے پھاڑ کر وقت کو ٹٹولتے نہیں دیکھا۔

باپ کی بھنکتی گالیوں کو جھیلتے۔ وہ ہمیشہ رات کو پیٹ سے سمٹی ٹانگوں میں دونوں ہاتھ دبائے۔ سونے کا ڈھونگ کرتے ہوئے۔ ٹاٹ کے ٹکڑے پر ایسے پڑی رہتی جیسے گندی نالی کے قریب پیٹ میں منہ چھپائے کتے کا پلا پڑا ہو۔

اس نے اپنی سٹی ٹانگوں کو آہستہ سے سیدھا کیا۔ بانہوں کو تھوڑا سا پھیلایا۔ جسم کو کمان کی طرح کھینچ کر بدن کے تناؤ کو ڈھیلا کیا اور چھت پر لگے ٹین کے ٹکڑے کو تکتے ہوئے نڈھال پڑی رہی۔ تبھی اس کی ننگی ٹانگوں کو ہلکی سی نمی کا احساس ہوا۔ وہ چونکی۔ بدن کو پیٹ کی طرف موڑا۔ ٹاٹ کے ٹکڑے اور فرش کو ہولے سے ٹٹولا۔ اسے اطمینان نہیں ہوا تو اپنے زیر جامہ کے نچلے حصے کو چھو کر دیکھا۔ وہاں خشکی تھی۔ خشکی محسوس کر کے اسے تسکین ہوئی کہ آج اسے ماں کی مار نہیں پڑے گی۔ آج اس نے بستر میں پیشاب نہیں کیا تھا۔

اسے یاد نہیں۔ اس نے پہلی بار نیند میں کب بستر یا فرش بھگویا تھا۔ البتہ وہ حادثہ اس کے ذہن میں تپتے سورج کی طرح روشن ہے۔ کہ اس نے پہلی بار جاگتے

میں کب بستر گیلا کیا تھا۔

اس روز آدھی رات کو جھگی کا دروازہ کھنکھنانے کی آواز نے اسے گہری نیند سے بیدار کیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ جھگی میں چمنی کی دھندلی روشنی میں ہر چیز تھکی ہاری سو رہی تھی۔ بغل میں ماں اور ماں کی دوسری طرف اس کا چھوٹا بھائی بے سدھ، جسم پھیلائے پڑے ہوئے تھے۔ جھگی کے بیچوں بیچ چھپر کو ٹکانے کے لیے کھڑا کیا گیا ٹیڑھا میڑھا کھمبا کسی بوڑھے بھوت کی مانند ان تینوں پر پہرہ دیتا نظر آیا۔

پھر ایک بار، جھگی کے گلے سڑے دروازے کا ڈھانچہ بج اٹھا۔ اس نے ماں کی جانب دیکھا۔ ماں کے کان بند دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر بدن ٹوٹتا سا محسوس ہوا۔

سویرے ہی سے وقت اس کے تروتازہ جسم کو تھکان سے دوچار کر دیتا تھا۔ منہ اندھیرے ہی وہ دوسری جماعت کی اپنی کتابیں لے کر بیٹھ جاتی۔ ماں آٹا گوندھ کر چولہا پھونکنے لگتی۔ پھر روٹی بنانے کی آواز اور ان کے سینکے جانے کی سوندھی خوشبو سے اس کے پیٹ میں بھوک کروٹیں لینے لگتی۔ دن بھر کا ایندھن پیٹ میں ڈال کر۔ وہ بھائی بہن ماں کے پیچھے پیچھے ایسے نکل پڑتے، جیسے گائے کے پیچھے بچھڑے چل رہے ہوں۔ ماں چار پانچ گھروں کا بھانڈا برتن، جھاڑو پونچھا کرتی، وہ اسکول کا وقت ہونے تک ماں کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔ اسکول چھٹتے ہی پھر ماں کے ساتھ کام میں جٹ جاتی۔ ماں برتن مانجھتی تو وہ ان برتنوں کو پونچھ، ایک طرف سجا کر رکھتی۔ دھوئے ہوئے کپڑے سکھانے کے لیے ماں تار پر ڈالتی تو وہ بالٹی میں سے نچوڑے ہوئے کپڑے لا لا کر ماں کو دیتی۔ گھر کی مالکن قریب سے چھوٹا موٹا سودا سلف لانے کو کہتی تو بھاگ کر لے آتی۔ بھائی اس کا جس گھر میں ماں کام کرتی رہتی اس گھر کے دروازے پر بیٹھا اکیلا کھیلتا یا جھپکیاں لیتا کسی کونے میں سو جاتا۔

شام کو لوٹتے وقت ماں کچھ تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھتی۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے، راہ میں پان کی دوکان یا ریستوران کے پاس پڑے کولڈ ڈرنکس کے بوتلوں کے ڈھکن، ماچس کی خالی ڈبیاں، سگریٹ کے خالی پاکٹ جمع کرتے ہوئے۔ موج مستی سے گھر پہنچتے، ماں اسے دیر سے آنے پر جھڑکتی۔ وہ اداس ہوجاتی۔ پھر کچھ ہی لمحوں میں سب کچھ بھول بھال کر گھر کے برتن مانجھنے بیٹھ جاتی۔ ماں، کام کے گھروں سے بچا کھچا لایا ہوا، گرم کرنے لگتی۔ رات کا لگان چکانے کے بعد پیٹ اسے سونے کی اجازت دیتا۔ تب کہیں جاکر وہ ٹاٹ کے ٹکڑے پر ڈھیر ہوجاتی۔

اب کی بار دروازے پر لاتے زور سے تھاپ پڑنے لگی۔ جیسے دروازے کی بڈیاں ٹوٹ کر ایک طرف گریں گی۔ تھاپ دینے والے کا ہاتھ اندر گھس کر سونے والوں کا گلا دبوچ لے گا۔ دروازے کی درازوں سے گرم ہوا کی طرح گالیاں جھگی میں بھگدڑ مچانے لگیں۔

گالیوں کی آواز سن کر رانو کی ماں نے کروٹ لی______

رانو۔ او رانو۔ اٹھ، تیرا باپ آیا ہے۔ جا دروازہ کھول۔

وہ بے دلی سے اٹھی۔ کھجاتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھی۔ دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی لپکتے شعلے کی مانند پہلے گالی اندر داخل ہوئی پھر لڑکھڑاتے قدموں سے بڈیوں کا ڈھانچہ اندر آیا۔ اندر آتے ہی سامنے بیٹی کو کھڑا دیکھ کر اس نے بیٹی کو تھپڑ رسید کردیا______

حرام زادو۔ دروازہ جلدی کھولتے تو کیا موت آجاتی؟

وہ سسکنے لگی۔

باقی غصہ بیوی پر نکالنے وہ آگے بڑھا۔ چمنی کی دھواں آمیز روشنی میں بیوی کو پیر پھیلائے اونگھتے دیکھا تو اس کی سرخ آنکھوں میں دھنک سی لہرا گئی۔ نگاہیں نیم خوابیدہ جسم کے نیم دائروں پر منڈلانے لگی۔ حلق میں اٹکی ہوئی

گالی کو نگل کر وہ دیوار پر لگی کھونٹی کی جانب چلا گیا۔

ماں کو تھکان سے چور سوتا ہوا دیکھ کر رانو نے اپنی سسکیاں دبائیں اور ماں کی بغل میں لیٹ گئی۔

رانو کے باپ نے قمیض اتار کر ہاتھ کھونٹی کی طرف بڑھایا۔ کھونٹی پر نظر پڑتے ہی ہاتھ خلا میں اٹک کر رہ گیا۔ اس کے کانوں کی لویں گرم ہونے لگیں۔ اس نے جھٹ سے کھونٹی کو قمیض سے ڈھانپ دیا۔ لنگی پہنی، پینٹ کو ایک طرف پھینکا اور پلٹا۔

خوا پر دھاوا بولنے کو آدم تیار تھا۔

آگے بڑھا تو خیال آیا کہ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ پہلے پیٹ کی آگ بجھالی جائے۔ بیوی کہاں جائے گی، وہ تو گھر کا مال ہے ـــــــــــ وہ کھانے کے لیے مڑا۔ حسبِ معمول بچا کھچا کھانا دو برتنوں میں ڈھک کر رکھا ہوا تھا۔ برتن کے اطراف دو چار چھوٹے بڑے تل چٹے گھوم رہے تھے۔ تلچٹوں کو دیکھا تو وہ آگ بگولہ ہو اٹھا۔

یہ کیا! میں گھر کا مرد ہوں، بھکاری تو نہیں، تلچٹوں کا جھوٹا کھانا میرے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ دو گھر کا کام کیا کرتی ہے کُتیا کو مستی آئی ہے۔ گھر والے کو پر دینے بھی اٹھ نہیں سکتی۔

خیالوں کا سلسلہ ٹوٹا تو وہ چلا اٹھا ـــــــــــ

چل ہٹ، تیری ماں کا ـــــــــــ

اس نے کھانے کے برتنوں کو ٹھوکر ماری۔ برتن ہوا میں اچھلے، بانس کی دیوار سے ٹکرا کر چھن ن ن ـــــــــــ چھن ن ن بج اٹھے۔ جھگی کے باہر اونگھتا ہوا کتا ڈر کے مارے کھڑا ہو کر بھونکنے لگا۔

جھگی کے باہر کتا بھونک رہا تھا، جھگی میں یہ گالیاں بک رہا تھا۔ رانو نے اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں۔ رانو کی ماں نے کہنی کے بل جسم کو اوپر اٹھایا، اور گھر والے

کی جانب دیکھ کر چلائی ـــــــــ لوگوں کو چین سے سونے کیوں نہیں دیتے۔ تب سے کتے کی طرح بھونکے جا رہے ہو۔

تو نے مجھے کتا کہا؟ حرام زادی ـــــــــ تیری ـــــــــ

اس کا جسم سخت ہو کر کانپنے لگا، وہ کسمساتا ہوا ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا۔

خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا تو ـــــــــ وہ بھڑک اٹھی۔

دیکھتے دیکھتے ہی ان کی گالیاں گتھم گتھا ہو کر بھڑ گئیں۔ ساری جھگی گالیوں کے شور میں ڈوب گئی۔

مرد کا جی چاہ رہا تھا کہ گھر والی کی بولتی بند کرنے وہ اس کا گلا گھونٹ دے۔ اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر چولہے میں جھونک دے، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گلی میں کتوں کو ڈال دے ـــــــــ یہ سب اس کے جی میں تو آ رہا تھا، مگر اس کے پاس اتنی طاقت اور حوصلہ نہیں تھا ـــــــــ اس کی کمزوری سے اس کی انا کو ٹھیس پہنچی۔ اس کی انا نے اس کے اندر کے شیطان کو جگایا۔ شیطان نے پینترا بدلا۔ اس نے دونوں ہاتھ بجائے، پھر ہاتھ جوڑ کر بولا ـــــــــ

اچھا بابا، میری ماں ـــــــــ کتیا سالی ـــــــــ سو جا اب ـــــــــ

شوہر کی پسپائی دیکھ کر وہ آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔

میں سالا بھڑوا ہوں، جو تجھ جیسی چلتر عورت سے الجھتا ہوں ـــــــــ

بڑبڑاتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ بیوی کے سرہانے آ کر اس نے دیکھا، ایک طرف چھوٹا بیٹا فرش پر بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے قدموں کے پاس رانو ماں کے پیٹ پر ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی تھی۔

رانو نے باپ کے قدموں کی چاپ کو اپنے قریب رکتے ہوئے سنا تو اسے کپکپی محسوس ہوئی گھبراہٹ سے اس کی پلکوں میں جنبش ہونے لگی۔ سرہانے کھڑے باپ نے سمجھا، اس نے سونے کا ڈھونگ رچایا ہے۔ طیش میں آ کر بولا ـــــــــ جب دیکھو سور کے بچوں کی طرح ماں کے پیٹ سے چپکی رہتی

ہے۔

اس نے رانو کو بانہہ سے پکڑ کر ایک طرف ایسے پھینک دیا، جیسے کچھ دیر پہلے اپنی پینٹ کو پھینکا تھا۔ رانو کا جسم دیوار سے جا ٹکرایا۔ بانس کی دیوار یوں کانپ اٹھی جیسے زلزلہ آیا ہو۔

رانو نے محسوس کیا، اس کا زیر جامہ نم ہو رہا ہے، پیشاب اس کی رانوں اور پاؤں کو بھگوتے ہوئے فرش کی جانب بہہ رہا ہے۔

دھماکے کی آواز پر رانو کی ماں نے کروٹ لی، رانو دیوار سے لگی کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو تو بہہ رہے تھے مگر باپ کی بربریت کے آگے اس کی آواز حلق میں منجمد ہو گئی تھی۔ رانو کی ماں نے شوہر کی جانب دیکھا، جو اس کے سر پر سوار تھا۔

بیوی کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو اس نے یکلخت لنگی کو نیچے گرا دیا جیسے اس نے اپنے ارادے کا اعلان کر دیا ہو۔

رانو کی ماں نے برق رفتاری سے پلٹ کر چمنی کے قریب رکھے لوٹے کو چمنی پر الٹا ڈال دیا۔

بے شرم، دیکھتے نہیں، بچی جاگ رہی ہے۔

گھپ اندھیرے میں رانو نے ماں کو چیختے ہوئے سنا۔ جواب میں لڑکھڑاتی ہوئی باپ کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی ______ تو کیا ہوا؟ اسے بھی تو بڑی ہو کر یہی کرنا ہے۔

بلکٹ کمینے۔ اپنی بیٹی کے لیے ایسی بات کرتا ہے۔

چل سالی بس کر ______ لیٹ جا ______

بھڑوے، دو تو جن کے دی ہوں، اور جنوں گی تو پالے گا کون؟ تیری ماں آئے گی پالنے ______

اب بھاشن بند کر ______ غصہ مت دلا ______ ورنہ ______

چپ پڑے ہٹ کینے ـــــــــ

رانو کے لیے یہ سب نیا نہیں تھا۔ یہ مہا بھارت تو آئے دن اس جھگی میں ہوا کرتی تھی۔ آئے دن دروپدی کے کپڑے اتارے جاتے۔ اس کی ماں اپنی ہڈیاں تڑوایا کرتی اور ہر بار بعد پٹائی کے وہ اپنی ماں کے بدن پر ہلدی کے لیپ لگا کر گرم کپڑے سے سینکا کرتی۔ ماں آنسو بہاتی۔ نصیبوں کو کوستی۔ کراہتی۔ شوہر کو گالیاں دیتی۔

مگر آج کی لڑائی میں کچھ زیادہ ہی گرمی تھی۔ حراس زدہ رانو اس اندھیرے میں ان گونجتے۔ لڑکھڑاتے جملوں کی تاب نہیں لا پا رہی تھی۔

یک بیک برتنوں کی زوردار آواز ہوئی۔ جیسے جھگی کے برتن بھی لڑائی میں شامل ہو کر بکھر گئے ہوں۔

رانو نے اندازہ لگا لیا۔ باپ برتنوں پر گرا ہے۔ کچھ وقفے کے بعد کوئی برتن پھر کھنک اٹھا۔ جیسے زیرِ پا آگیا ہو۔

سالی رنڈی، کتیا۔ تو نے مجھے لات ماری ہے ؟ــــــ آج ـــــ آج میں تیری پھاڑ کر رکھ دوں گا۔

رانو اب پریشان ہو گئی۔ اگر باپ نے ماں کے کپڑے پھاڑ دیے تو کل وہ کام پر کیسے جائے گی ؟ کام کو نہیں جائے گی تو ــــــ ایک ہی تو ساڑی۔ چولی ہے اس کے پاس۔ جنھیں وہ کئی کئی دنوں کے بعد دھوتی ہے اور دھلائی کے دن ان کے سوکھنے تک جھگی میں قید رہتی ہے۔

اب اس کی ماں جس طرح کراہتے ہوئے۔ گھٹی گھٹی سی آواز میں ٹکڑے ٹکڑے گالیاں دے رہی تھی۔ اس سے رانو کو اندازہ ہوا کہ وہ دونوں اب باقاعدہ ہاتھا پائی کرتے ہوئے بھڑ گئے ہیں۔

مت کر ـــــ میں کہتی ہوں چھوڑ دے ـــــ مت کر ـــــ بہت برا ہو گا دیکھ ـــــ

تبھی اس کا باپ چیخ اٹھا ـــــــ مار ڈالا سالی کتیا نے ـــــــ
تیری ماں کی ـــــــ

رونی سی آواز فیڈ آؤٹ ہو گئی۔

لڑکھڑانے کی آہٹ ہوئی۔ چھت کو تھامے ہوئے کھمبے سے کوئی ٹکرایا۔ چھت کے خستہ ٹن بج اٹھے۔ دھڑام سے دروازہ کھلا۔ وہ کانپ اٹھی۔

اس نے اپنے برہنہ باپ کو زیرِ ناف ہاتھ دبائے باہر بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اس کا جسم خوف سے لرزنے لگا۔ جیسے اس نے تاریکی میں بھوت کو بھاگتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔

اس واقعے کے بعد راتوں کو نیند میں بستر کا گیلا کرنا جیسے اس کا مقدر بن گیا۔

ذہن پر تپتے سورج کی طرح روشن واقعہ کو یاد کرتے ہوئے وہ پسینے سے تربتر ہو گئی۔ گردن کے نیچے کا پسینہ پونچھتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی۔ سامنے جھگی کا بند دروازہ نظر آیا۔ جس کی درازوں سے چاندنی امید کی کرن کی طرح اندر داخل ہو رہی تھی۔ درازوں سے چاندنی کو چھن کر اندر آتا دیکھ کر اسے یاد آیا ـــــــ اس رات انھیں درازوں سے باپ کی گالیاں اندر داخل ہو رہی تھیں اور اسی دروازے سے وہ ننگا بھاگا تھا۔ ماں اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک کھلے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کھڑی رہی۔ پھر اس کے ہاتھ سے چاقو گر گیا تھا اور وہ سسکتے ہوئے کھمبے کے سہارے بیٹھ کر رونے لگی تھی۔

جب رانو کو یقین سا ہونے لگا کہ باپ اتنی جلدی جوابی حملے کے لیے لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تو اٹھ کر ڈرتے ہوئے۔ سسکیاں دبائے ماں کے قریب گئی تھی۔ ماں نے اسے یکلخت سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ کافی دیر رو لینے کے بعد۔ ساڑی کے پلو سے ناک صاف کرتے ہوئے اٹھ کر نڈھال قدموں سے چلتے ہوئے ماچس کی ڈبیہ ڈھونڈ کر ماں نے چمنی کو روشن کیا۔ چمنی کی روشنی میں اس نے فرش پر خون کے دھبے دیکھے تھے۔ سونے کے اپنے

ٹاٹ کے ٹکڑے   کے پاس ڈھیر سارا خون پھیلا ہوا تھا اور پھر قطرہ قطرہ دروازے تک خون اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔

اسے یاد ہے۔ ـــــــــــ ماں ویران آنکھوں سے ان خون کے دھبوں کو دیکھتی رہی، یکایک اس کی جانب دیکھا اور آگے بڑھی تھی۔ زمین پر پھیلے خون کے پاس سے چوہے کے مرے ہوئے بچے جیسی کسی چیز کو اٹھا کر باہر پھینک آئی تھی۔ گیلے کپڑے سے فرش کو صاف کر کے دروازہ بند کیا تھا۔ اس کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ اسے بستر تک لے گئی تھی اور سینے سے چپٹا کر تھپکیاں دیتے ہوئے سلایا تھا۔

وہ اپنی ماں کے سینے سے لگی لگی دوسری سے تیسری جماعت میں آگئی۔ اس دوران اُس رات بھاگے ہوئے باپ کی پرچھائیں بھی جھگی کے دروازے پر نظر نہیں آئی۔ نہ اس کو کسی نے اس شہر میں دیکھا۔ نہ ہی کوئی خبر آئی۔ تینوں کی زندگی بڑے سکون اور چین سے گذر رہی تھی۔ ہنستے کھیلتے، کام کرتے ہوئے دن بیت رہے تھے۔ رانو کی ماں نے بچوں کے مستقبل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے خون پسینے کی کمائی کو بچا کر جمع کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔

بچوں کے لیے ماں، سانسوں کی مانند ایک ضرورت بن گئی تھی مگر ماں کے لیے وہ ذمہ داری تھے۔ ضرورت نہیں۔ ایک ڈھلتی شام، ماں کی ضرورت قدموں کی آہٹ بن کر جھگی کے دروازے پر سنائی دی۔ بہن بھائی دونوں نے کھیلتے ہوئے دروازے کی جانب دیکھا۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی کو روکے کوئی سفید پوش جھگی کے دروازے پر ٹھہرا ہوا نظر آیا۔ تھوڑی بہت جو روشنی اندر آرہی تھی۔ اس میں یکایک رکاوٹ آجانے سے جھگی میں اندھیرا پھیل گیا۔ بچوں کو آنے والے کی شکل ٹھیک سے نظر نہیں آئی۔ مگر رانو کی ماں نے، جو چولہے کے پاس بیٹھی سالن گرم کر رہی تھی، آنے والے کو فوراً پہچان لیا۔ ساڑی کے پلو سے ہاتھ پونچھ کر، وہ مسکراتے ہوئے اٹھی   ارے، آؤ آؤ

وہ اس کے قریب پہنچ گئی۔

وہ اندر آیا۔

اس کے ہمراہ زرد روشنی بھی داخل ہوئی۔

ٹھہرے ٹھہرے قدموں سے وہ بچوں کے قریب آکر رکا۔ رانو کی نظر آئینے کی طرح چمچا رہے اس کے جوتوں پر پڑی۔ رانو نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

رانو کی ماں نے جھٹ سے چٹائی بچھا کر اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ اس کا جوتے پہن کر چٹائی پر بیٹھنا رانو کو اچھا نہیں لگا۔

اس شخص نے رانو کے بھائی کو پچکارتے ہوئے اپنے پاس بلایا۔ وہ جھجکتے ہوئے اس کے قریب گیا۔

اس نے اسے گود میں لے لیا اور جیب سے چاکلیٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی دوسری چاکلیٹ اس نے رانو کو دینا چاہی، رانو سر جھکائے بیٹھی رہی مگر بھریاں کے کہنے پر چاکلیٹ اسے لینی پڑی۔ اس نے دیکھا ـــــــــ یہ وہی چاکلیٹ تھی ـــــــ جس بنگلے میں ماں کام کرتی تھی۔ وہاں بچوں کو یہی چاکلیٹ کھاتے ہوئے اس نے کئی بار حسرت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ بھائی کو بڑے چاؤ سے چاکلیٹ کھاتے ہوئے دیکھا تو اس کے منہ میں بھی پانی آگیا مگر فوراً اپنے ندیدے پن پر قابو پا کر اس نے چاکلیٹ کو بستے میں رکھ دیا۔

کیوں کھاؤ گی نہیں؟ ـــــــ اس نے پوچھا۔

بعد میں کھاؤں گی ـــــــ رانو نے ٹکا سا جواب دیا۔

لڑکیوں کی یہی عادت بری ہوتی ہے۔ ہر چیز کل کے لیے بچا کر رکھتی ہیں۔

اس کی نکتہ چینی سے برہم ہو کر وہ اٹھی۔ بستہ اٹھایا ـــــــ

کہاں چلی؟ ـــــــ ماں نے سوال کیا۔

باہر چبوترے پر۔ پڑھائی کرنے ـــــــ تنک کر اس نے جواب دیا۔

پڑھائی بعد میں کرنا۔ پہلے دونوں جاکر ہوٹل سے چائے لے آؤ۔

ماں کو پہلی مرتبہ پڑھائی سے روکنے پر اسے حیرت ہوئی۔ ماں نے اس کے ہاتھ میں گلاس تھمادیا۔ اور پیسوں کے لیے طاق پر رکھے ڈبے کی جانب بڑھی۔

یہ لو ــــــــــ اس آدمی نے پانچ کا نوٹ رانو کی طرف بڑھاکر کہا۔

نہیں نہیں، یہ گھر میرا ہے۔ چائے کے لیے پیسے تم دو، یہ کیسے ہوسکتا ہے!

میـــرا گھر! ــــــــ ماں کی اس بات سے رانو کو دھکا سا لگا۔ ماں ہر شخص سے اس گھر کو ہمیشہ ہمارا گھر کہتی ہے۔ آج اس اجنبی کے رُوبرو اس نے ہمارے گھر کو میرا گھر کہا!

ماں کے لفظوں کے بدلتے رنگوں سے وہ تڑپ اٹھی۔ مرد کے نام پر جو اس نے اپنے باپ سے پایا تھا، اس کے بعد کسی بھی مرد کو اس کا طفلانہ ذہن قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔

اس آدمی کے ذرا سے اصرار پر ماں نے پانچ کا نوٹ قبول کرلیا، اس نے دل شکستہ ہوکر بھائی کا ہاتھ تھاما اور چائے لانے چل پڑی۔

رات کے سناٹے میں دور کوئی کتا بھونکنے لگا۔ جھگی کے باہر سویا ہوا کتا بھی دو ایک بار بھونکا اور خاموش ہوگیا۔ اس نے سوچا ــــــــ آج اسے نیند کیوں نہیں آرہی۔ صبح ہونے کے انتظار میں وہ اتنی بیقرار کیوں ہے؟!

اب تک اس کی آنکھیں تاریکی سے ہم آہنگ ہوچکی تھیں۔ اس نے دھندلکے میں دیکھا، اس کا بھائی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ حسبِ معمول وہ ماں کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سو جائے تو یقیناً اسے نیند آجائے گی۔ ماں کی جانب نظریں گھمائیں تو وہ مایوس ہوئی۔ ماں خود اس شخص کے سینے پر ہاتھ رکھے اوندھی پڑی سورہی تھی۔

وہ لیٹ گئی۔ اس نے سوچا ــــــــ جب سے یہ شخص ہمارے گھر آیا ہے، گھر کا نظام ہی بدل گیا ہے۔

اسے خیال آیا ـــــــــ پہلے ماں شام کو گھر لوٹ کر کام کے گھروں سے بچا کھچا لایا ہوا گرم کرنے بیٹھتی تھی۔ اب اس شخص کے لیے روزانہ گرم گرم کھانا پکانے لگتی ہے۔ رات کو سونے کے سمئے ڈھبری جلتی رہتی تھی۔ اب بجھا دی جاتی ہے۔ تب ہم دونوں بھائی بہن ماں کے اطراف اس سے لپٹ کر سوتے تھے، اب ہمیں فاصلے پر سلایا جاتا ہے۔ ان دنوں ہر رات ماں کوئی کہانی یا قصہ سنایا کرتی تھی، اب وہ کانا پھوسی میں ماں کو نہ جانے کون سے قصے کہانیاں سناتا ہے۔ جنھیں سنتے ہوئے ماں دبی دبی سی ہنسی ہنستی رہتی ہے۔ ماں پہلے کبھی بھی اداس، خاموش، گہری سوچ میں ڈوبی رہتی تھی مگر اب خوش، چہکتی، ہنستی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ماں پہلے ماتھے پر چاند سا بڑا کم کم لگاتی تھی۔ ایک دن کام سے چھٹی لے کر اس کے ساتھ باہر کیا گئی، تب سے ماتھے کا کم کم ندارد ہے۔ ماں پہلے گلے میں منگل سوتر پہنتی تھی اب اس کی جگہ کالی پنی کے لچھے نے لے لی ہے پہلے وہ شخص ماں کو اس کے نام سے مخاطب کرتا تھا، اب نور کہہ کر بلاتا ہے۔

اس شخص کے لیے ماں کا یہ سب کر گذرنا اسے کھلتا ہے مگر پھر بھی کبھی کبھی اسے احساس ہوتا ہے ـــــــــ جب سے وہ شخص آیا ہے گھر کا ماحول بھرا بھرا سا لگتا ہے۔ جیسے باڑھ سے دریا کا پانی۔ بھائی پھدکتا رہتا ہے۔ بھائی بہن کے لیے اس چھوٹی سی زندگی میں پہلی بار نئے کپڑے آئے ہیں۔ ماں کے لیے دو ساڑی اور چولیاں ـ ـ ـــ ہفتہ میں دو ایک بار گوشت بھی گھر میں پکنے لگا ہے ـــــ ... ماں کے ہاتھ کا سالن اتنا اچھا تو نہیں بنتا، جتنا لذیذ کام کے گھروں کا بچا ہوا سالن ہوتا ہے۔ مگر اس سالن میں بوٹیاں نہیں ہوتیں۔ گھر کے سالن میں بوٹیاں بھی کھانے کو ملتی ہیں۔ اور پھر جھوٹن تو آخر جھوٹن ہوتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی لذیذ کیوں نہ ہو۔

اس شخص کے اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی وہ اس سے کٹی کٹی سی رہتی ہے۔ اس سے بات کرنے سے کتراتی ہے اور نہ ہی اس کی دی ہوئی چاکلیٹ کھانے کو

اس کا جی کرتا ہے۔ اس کا حال اس مکھی جیسا ہے، جو مکڑی کے جالے میں پھنسنے کے بعد جالے سے نکلنے کی جتنی کوشش کرتی ہے اتنا ہی وہ اس میں الجھنے لگتی ہے۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ کوئی ایک رائے قائم نہیں کر پا رہی تھی اس کے لیے۔ ماں کے لیے بھی اس کی رائے ڈانوا ڈول ہونے لگی ہے۔ کبھی تو ماں اسے اچھی لگتی ہے اور کبھی اس سے مایوس ہو جاتی ہے۔ کبھی چڑ جاتی ہے تو کبھی ماں کے رویے پر اسے رونا آجاتا ہے۔

اس او نگھتی فضا میں برتن گرنے کی آواز سے اس کی خلوت میں خلل پڑا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی آواز کی سمت دیکھا۔ دو چوہے دوڑتے ہوئے دیوار سے ٹکی المونیم کی پلیٹ گراتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

خلل انداز آواز سے چونک کر رانو کی ماں نے کروٹ لی۔ جسم کھجایا اور نیم خوابی میں بھگوان کا نام لیتے ہوئے نیند کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ لگایا۔

ماں کے منہ سے بھگوان کا نام سن کر رانو کو حیرت ہوئی۔ دن میں بیسیوں بار اللہ کو یاد کرنے والی ماں کو رات نیند میں اپنے پرانے بھگوان کیسے یاد آگئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

ماں کو گہری نیند میں سوتا دیکھ کر اسے بہت اچھا لگا۔ ماں ہفتے بھر سے بہت پریشان اور دکھی تھی۔ دن بھر لوگوں کے گھروں کا جھاڑو پونچھا اور رات دیر گئے تک اس شخص کی تیمارداری نے اسے تھکا کر چور کر دیا تھا۔ وہ شخص جو ایک سیٹھ کے پاس ڈرائیور کی نوکری کرتا ہے کچھ روز پہلے دورے سے لوٹا تو اپنے ساتھ بخار لیتا آیا۔ دو چار روز گھریلو علاج سے آرام نہیں ہوا تو ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر کی جانچ کے بعد پتہ چلا کہ میعادی بخار ہے۔ ڈاکٹروں نے دوائیاں لکھ دیں اور ساتھ میں آرام، پرہیز اور وقت پر دوائی لینے کی سخت تاکید بھی کر دی۔

رانو کی ماں کے کہنے پر اس نے کام سے چھٹی لے کر ڈاکٹر کی تینوں

پابندیاں اپنے پر عائد تو کر لیں مگر وہ بے انتہا پریشان نظر آتا تھا۔ آج شام کو وہ اور ماں ڈاکٹر کے پاس سے لوٹے تو اس کی پریشانی جیسے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ وہ بحران میں مبتلا تھا۔ بڑبڑاتے ہوئے گالیاں بک رہا تھا۔ وہ گالیاں کسے دے رہا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا مگر اسے پہلی مرتبہ اس طرح گالیاں بکتے دیکھ کر بہن بھائی دونوں سہم کر رہ گئے۔

وہ بخار اور پرہیز کی وجہ سے کافی کمزور ہوچکا تھا۔ کافی دیر تک بڑبڑاکر گالیاں بک کر تھک جانے کے بعد وہ بستر پر لیٹا تو رانو کی ماں نے اس کا سر دباتے ہوئے اس کی پریشانی جاننی چاہی تو معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینہ شروع ہونے والا ہے۔ کل پہلا روزہ ہے۔ مہینوں سے وہ رمضان شریف کے انتظار میں تھا اور آج ڈاکٹروں نے اسے روزہ رکھنے سے منع کر دیا۔

اس کی صحت کے پیش نظر رانو کی ماں نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ روزہ رکھنے کی ضد پر اڑا رہا۔ تب رانو کی ماں نے ایک تجویز پیش کی، جسے سن کر اس کے چہرے پر پریشانی کے بادل چھٹتے چھٹتے پھر گھر آئے۔

اس نے پریشانی سے کہا ـــــــــ تم روزے کیسے رکھ سکو گی؟

کیوں؟ آپ بیمار ہو کر رکھ سکتے ہیں تو میں آپ کی کمائی کھا کر ہٹی کٹی ہو گئی ہوں، میں کیوں نہیں رکھ سکتی؟

دل کو تسلی نہیں ہوئی تو اس نے روزے کے اصول اور قاعدے بتائے اور بتایا کہ روزہ رکھنا اتنا آسان کام نہیں ہے رانو کی ماں پر ان باتوں سے کوئی خوف طاری نہیں ہوا۔ وہ اس کی پیشانی کے منتشر بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے بولی ـــــــــ

آپ فکر نہ کریں، میں روزے رکھ کر خدا سے پرارتھنا کروں گی کہ اس کا پنیہ آپ کو ملے، بس۔

اس نے رانو کی ماں کا ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھا۔ کچھ لمحے خاموش رہا، اور

پھر جھنجھلاہٹ کے ساتھ بولا........

روزہ رکھنا آسان کام نہیں ہے۔

فاقہ کرنے والوں کے لیے روزہ رکھنا مشکل نہیں ہو سکتا۔

رانو کی ماں نے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اس کے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

کچی نیند سے چونک کر رانو یکلخت جاگ گئی۔ اسے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی آنکھ کب اور کیسے جھپک گئی تھی۔ وہ تو پو پھٹنے کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے دیکھا، ماں چمنی کی مدھم روشنی میں چولہے کے پاس بیٹھی کچھ پکانے میں مصروف تھی اور وہ شخص ویران آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ پل وہ ماں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی، پھر اٹھ کر ماں کے پاس گئی۔ کافی دیر گم سم بیٹھی رہی اور بیچ بیچ میں یونہی جسم کو کھجایا اور پھر کب ماں کے کام میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا اس کا اسے علم بھی نہیں ہوا۔

سحری کا وقت ہوتے ہوتے کھانا تیار ہوگیا۔ ماں نے رانو سے پوچھا۔۔۔

تو اتنا جلد کھائے گی یا صبح۔۔۔۔۔۔

میں بھی تمہارے ساتھ کھاؤں گی۔

رانو نے پانی کا لوٹا اٹھایا۔ کلی کی، منہ دھویا اور پالتی مار کر ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ ماں نے پروسی ہوئی تھالی اس کے سامنے رکھی اور اپنی تھالی لے کر اس شخص کے بستر کے قریب جاکر بیٹھ گئی۔ رانو نے نوالہ منہ میں لیتے ہوئے دیکھا۔ اس شخص نے ماں کی روٹی سے ایک ٹکڑا توڑا اور کہا ۔۔۔۔۔۔ یہ تمھاری زندگی کا پہلا روزہ۔ کہو، بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ماں نے دہرایا۔ اس شخص نے روٹی کا ٹکڑا ماں کے منہ میں رکھا۔ ماں روٹی چبانے لگی۔ اس شخص نے اطمینان سے آنکھیں موند لیں۔ دونوں خوش نظر آئے۔

ان دونوں کو خوش دیکھ کر آج پہلی بار اسے بڑی مسرت ہوئی۔

رانو کی ماں نے بیٹے کو شوہر کی تیمارداری کے لیے گھر پر چھوڑا اور رانو کو لے کر تڑکے ہی کام پر نکل گئی۔ آج وہ کام سے جلد فراغت پا کر گھر لوٹ آنا چاہتی تھی۔ ایک بنگلہ پر رانو کی ماں برتن مانجھ کر، رانو کو دے رہی تھی اور رانو ان برتنوں کو سکھاتے ہوئے سلیقہ سے ایک طرف رکھ رہی تھی۔ تبھی بنگلہ کی مالکن نے آکر رانو سے کہا ______

یہ لے، تھوڑا سا سالن اور روٹیاں ہیں کھالے۔

نہیں، میں آج نہیں کھاؤں گی ــ ــــ رانو نے خوش دلی سے جواب دیا۔

کیوں؟ بھوک نہیں لگی؟

میرا روزہ ہے .... ـــــ اس نے فخر سے جواب دیا۔

مالکن نے کوئی خاص ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ ہلکے سے مسکرا کر لوٹ گئی۔ مگر رانو کی ماں کے پورے جسم میں خوشی برق کی مانند لہرا گئی۔ اس کے ہاتھوں نے کام کی رفتار اور تیز کر دی۔

گھر لوٹتے ہی رانو کی ماں نے رانو کے روزہ کی بات اپنے شوہر سے کہی تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ خوشی سے اس کا دل اچھل کر منہ کو آنے لگا۔ اس نے رانو کو یکلخت گود میں اٹھا کر باہوں میں بھر لیا۔ اور اس کے رخساروں پر بوسوں کی بارش کر دی۔ رانو کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔ اس کے باپ نے اسے گود میں لے کر کبھی چوما نہیں تھا۔ باپ کے پیار اور محبت سے وہ ناواقف تھی۔ آج اس شخص کے پیار اور بوسوں سے وہ شرابور ہوگئی۔ اس کا جی چاہا ______ وقت ٹھہر جائے لمحہ منجمد ہوجائے۔ اور وہ یوں ہی بوسوں میں شرابور ہوتی رہے ______

... مگر وقت نہ رکتا ہے نہ رکا ــ ــ ــ نہ لمحے منجمد ہوئے۔

اس کی آرزو کا پیمانہ تب چھلکا، جب ماں نے اسے کام میں ہاتھ بٹانے کو کہا۔

پیار میں بھیگے اپنے وجود کو اس نے سمیٹا اور کام میں جٹ گئی۔۔۔۔۔۔۔

افطار کا وقت ہوا تو رانو کی ماں افطاری کے برتن لے کر اپنے شوہر کے بستر کے پاس آگئی۔ رانو جو مسالہ پیسنے کے بعد سِل بٹّہ دھو کر ایک طرف رکھ چکی تھی، فراک سے ہاتھ پونچھتے ہوئے آئی تو اس شخص نے باہیں پھیلادیں مگر وہ اس کی باہوں میں آنے کے بجائے دیوار کی جانب مڑی اور دیوار پر ٹنگی کعبہ کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑے اور آنکھیں بند کرلیں، مگر وہ پریشان ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اللہ سے کہے تو کیا کہے ۔۔۔۔۔۔ کون ہوتا ہے وہ اس کا کیا رشتہ ہے دونوں کا؟ کیا نام دے اس رشتے کو؟

اچانک اسے شدت سے پیاس کا احساس ہوا۔ وہ جھٹ سے بڑبڑائی ۔۔۔۔۔۔ اے اللہ! اس آدمی کو جلدی سے اچھا کردے۔ میں پورا مہینہ روزہ رکھوں گی۔

جوں ہی رانو دعا مانگ کر پلٹی۔ اس شخص نے اس کے گلے میں بار ڈال کر ماتھے کو چوما اور کہا ۔۔۔۔۔۔

بیٹی، پہلا روزہ مبارک!

جانے دعا نے اثر کیا، یا دوا نے۔ رفتہ رفتہ وہ شخص صحت یابی کے زینے طے کرنے لگا۔

ہر صبح سحری کے لیے وقت کے ساتھ ہوڑ لگتی رہی۔ ہر شام افطار سے پہلے خدا کا شکر ادا ہوتا رہا۔ یونہی رمضان شریف کے بیس دن گذر گئے۔ ان بیس دنوں میں وہ شخص اس قدر صحت مند ہوچکا تھا کہ روزہ رکھ سکے۔

رانو اور اس کی ماں کے چہرے پر جیسے چراغاں روشن ہوگئے۔ وہ شخص بھی خوش تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی اس کے چہرے پر اداسی اپنے نشان ایسے چھوڑ جاتی جیسے ساحل پر لہریں جھاگ چھوڑ کر لوٹ جاتی ہے۔ رمضان کے اکیسویں دن اس نے اپنا پہلا روزہ رکھا۔ اس خوشی کے موقعے پر اپنے چہرے کی اداسیوں پر

تمت پڑھنے کے لیے اس نے اپنی بیوی اور رانو کی روزہ کشائی کرنے کی ٹھانی۔ عید کے اخراجات کے لیے اسے کچھ پیسے درکار تھے۔ ان دنوں اس کے علاج اور دیگر چیزوں پر کچھ زیادہ ہی خرچ ہوگیا تھا۔ دوپہر کے قریب اس نے کئی دنوں کے بعد آج جوتوں کو پالش کر کے چمکایا۔ کلف کی ہوئی وردی پہنی اور لڑکے کے ہمراہ یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ وہ اپنے سیٹھ کے بنگلے جائے گا۔ کچھ پیشگی طلب کرے گا۔ اور بازار ہوتے ہوئے گھر آئے گا۔

اس کے جانے کے بعد رانو کی ماں نے کچھ پیسے دے کر رانو کو مٹھی بھر چاول اور نمک لانے کے لیے نکڑ کی دوکان کو بھیجا اور خود رقیق گوبر سے جھگی کو لیپنے لگی۔

رانو، چاول اور نمک لے کر لوٹی تو اس کی ماں نے اس کے بال سنوارے۔ پھر بیٹی نے ماں کے بالوں میں کنگھی کی۔ اسی طرح دوسرے چھوٹے موٹے کاموں سے فرصت ملی تو وہ دونوں وقت کاٹنے کے لیے اس شخص کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگیں۔

انتظار میں کٹتے وقت جب ان کو کاٹنے لگا تو وہ پریشان ہوگئیں۔ ماں اس بات سے بے چین تھی کہ شوہر بیماری سے اٹھ کر آج پہلی بار گھر سے باہر نکلا ہے اور بیٹی اس لیے بے صبر ہو رہی تھی کہ آج وہ شخص اس کے لیے کھجور اور مچھلی لے آنے والا ہے۔ تلی ہوئی مچھلی تو اس نے جھوٹن میں ایک دو بار کھائی تھی۔ مگر کھجور اس نے بازار میں صرف بکتے ہوئے دیکھے تھے، چکھے کبھی نہیں۔

بے چینی اور بے صبری کے عالم میں ماں بیٹی چوکھٹ پر بیٹھی تھیں کہ دو کڑیل جوان لاٹھیاں لیے جھگی میں داخل ہوئے اور دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ ان کو دیکھ کر ماں بیٹی کو حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ان سے کچھ پوچھیں تب تک ایک عورت بڑے رعب سے دروازے میں دیوار کی مانند ٹھہر

گئی۔ انگارے برساتی اس کی آنکھوں نے ماں بیٹی کی نظر کو ایسے باندھ لیا کہ وہ پلکیں جھپکانا بھول گئیں۔ عورت، رانو کی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرائی ــــــــ

تو تم ہو، وہ چھمک چھلو ــــــــ وہ دو قدم آگے بڑھی۔

رانو کی ماں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

عورت نے اپنا دایاں ہاتھ پیچھے کی طرف بڑھایا۔ دائیں طرف کے جوان نے اپنی لاٹھی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ عورت نے لاٹھی پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی اور کڑک کر پوچھا ــــــــ کہاں ہے وہ؟

کو ــــــــ کون؟ ہکلاتے ہوئے رانو کی ماں بولی۔

میرا خصم ــــــــ تیرا یار ــــــــ

اس نے رانو کی ماں کے سر پر لاٹھی کا بھرپور وار کیا۔ رانو کی ماں نے چیخ کر سر تھام لیا۔ رانو اپنی ماں کی جانب بڑھی تو بائیں طرف ٹھہرے ہوئے آدمی نے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا۔ وہ رونے لگی۔

بتا کہاں چھپا رکھا ہے، اپنے یار کو؟

سوال کے ساتھ ہی لاٹھی کا وار ہوا۔ عورت بار بار وہی سوال دہراتی رہی اور لاٹھی کا وار کرتی رہی۔ جیسے طبلے پر تھاپ دے رہی ہو۔

ماں بیٹی کی چیخ پکار سن کر باہر لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی مگر وہ صرف تماش بین بنے باہر سے جھانکتے رہے۔ مار مار کر دل کی بھڑاس نکل گئی تو لاٹھی جوان کو لوٹا کر اس نے کہا ــــ ... ــــ چلو ہم بھی دیکھتے ہیں، کب تک چھپتا ہے حرام زادہ۔

وہ جھگی سے باہر نکلی۔ بھیڑ نے راستہ دے دیا۔ وہ بڑی شان سے بستی سے گذر گئی۔

عورت نے پیٹھ کیا پھیری بھیڑ جھگی میں کچھ اس طرح داخل ہوئی جیسے پشتہ

ٹوٹنے سے دریا کا پانی جھگی میں گھس آیا ہو۔ جھگی میں بھیڑ کے گھستے ہی تجسس نے کئی سوال کھڑے کر دیے۔

وہ کون تھی؟

کیوں آئی تھی؟

اس نے تم کو کیوں مارا؟

سوال ٹکراتے رہے جھگی کی دیواروں سے، بیٹی کے کانوں سے اور ماں کے زخموں سے، مگر جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ ان سوالات کا جواب تھا وہ، جواب اس عورت نے لاٹھی کا پہلا وار کرتے ہوئے بتایا تھا ______ میرا خصم۔۔ تیرا یار۔

کیا کہے وہ لوگوں سے؟ کیسے کہے! اسے ابھی معلوم ہوا تھا کہ وہ کون تھی۔ کیوں آئی تھی۔ کیوں پیٹا تھا اس نے۔

تجسس کی پیاس ادھوری رہی تو ایک ایک کرکے لوگ لوٹنے لگے۔ آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں جھگی ویران ہوگئی۔

کافی وقت گذر چکا تھا۔ سسکیوں کی آنچ ماند پڑ گئی تھی۔ جھگی میں تھکان کے سائے منڈلانے لگے تھے کہ رانو کا بھائی جھکڑ کی طرح داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ کسی عورت کے بھڑکانے پر اس شخص کو مار پیٹ کر کے دو لوگ جبراً اٹھا کر لے گئے۔ لڑکے نے اغوا کی روداد تفصیل سے سنائی۔ سسکیاں پھر ابھریں، جھگی میں صف ماتم بچھ گئی اور نوحہ خوانی کا سا ماحول پیدا ہوگیا۔ رانو کی ماں چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ بچے گھبرا کر اس سے لپٹ گئے۔ تو اس نے اپنا سر کھمبے پر پٹکنا شروع کر دیا۔ جھگی کا ڈھانچہ تھرانے لگا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔

زلزلہ کچھ لمحوں کے لیے ہی آیا مگر اپنے گہرے نشان چھوڑ گیا۔

ہم آہنگی کی ڈور میں بندھی ماں بیٹی نے باقی بچے روزوں کی رسم سحری روکھی سوکھی کھا کر اور دعوتِ افطار دو قطرے اشک پی کر کرلی۔ رمضان، مثلِ

محرم گذر گیا مگر وہ شخص نہیں آیا۔

رمضان کے روزے ختم ہوئے تو ماں بیٹی میں جو ایک سلسلہ تھا وہ ختم ہوگیا۔ اب وہ اپنے اپنے خیالوں میں مبتلائے غم رہنے لگیں۔ جگی میں قرابت کا جو ماحول تھا اس میں اجنبیت کی دھند پھیل گئی۔ وقت کے ساتھ جس راہ سے وہ شخص گیا تھا، اس پر سے اس کے نقشِ پا بھی مٹ گئے۔ مگر ماں بیٹی کے ذہنوں پر مرتسم وہ نشان نہیں مٹے جو وہ شخص چھوڑ گیا تھا۔

آج کل گھر لوٹتے ہوئے رانو راستے پر سے کولڈ ڈرنکس کی بوتلوں کے ڈھکنے، ماچس کی خالی ڈبیا، یا سگریٹ کے خالی پاکٹ چننے میں دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ نہ کسی کھیل میں اس کا دل لگتا تھا۔ ہر دم ماں کے ساتھ خاموشی سے جٹی رہتی یا کتابوں میں کھوئی رہتی۔

ایک ڈھلتی دوپہر کو پیٹھ پر وہ پانچویں جماعت کی کتابوں کے بستے کا بوجھ اٹھائے اسکول سے لوٹ رہی تھی، تبھی اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کوئی چاپ اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ اس نے چلنے کی رفتار کچھ تیز کرلی۔ چاپ نے بھی تیزی اختیار کی تو وہ گھبرا گئی۔ پھر اس نے سوچا شاید یہ اس کا وہم ہے۔ کوئی چاپ واپ اس کا پیچھا نہیں کر رہی۔ مگر وہ مڑ کر دیکھنے کا حوصلہ جٹا نہ پائی۔ اس نے دل کی دھڑکنوں کو روک کر غور سے اس آہٹ کو سنا تو اسے یقین ہوگیا، جیسے کوئی پھٹے پرانے جوتے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس نے بھاگنے کی سوچی کہ کسی نے دھیمے لہجے میں اسے بلایا۔ وہ دوڑنے کو تھی کہ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ رک گئی۔ اس کے پاؤں کانپنے لگے خوفزدگی کے عالم میں اس نے مڑ کر دیکھا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ اسے پہچانتے ہوئے بھی نہیں پہچان پائی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ وہی شخص ہے یا اس کا ہیولیٰ ہے۔ سیاہ دائروں کے درمیان دو بے نور آنکھیں۔ سر اور داڑھی کے روکھے سوکھے بے ترتیب بال۔ پرانا بدرنگ اور ملگجا لباس جسم سے پسینے اور

میل کی انمٹ مرکب بو۔ جانے کتنے عرصے سے اس جسم نے پانی کو چھوا نہیں تھا۔
ہیبت سے رانو کے چہرے کے رنگوں کو بدلتے دیکھ کر اس نے
پوچھا______مجھے پہچانا نہیں؟
رانو نے کتراتی نظروں سے نیچے دیکھا۔ اس کی نظریں اس کے جوتوں پر ٹک
گئیں۔
تمہارے جوتے پورے پھٹ گئے ہیں۔
اس نے رانو کی بات ان سنی کی، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ہلکے سے
دبایا______رانو نے قدم بڑھایا______وہ بھی اس کے ہمراہ چلنے لگا۔
دونوں خاموش______آہستہ آہستہ چلتے رہے۔
کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ رانو کو لے کر راستے کے کنارے کی پلیا کے
پشتے پر جا بیٹھا______وہ اب بھی خاموش تھا۔ اس شخص کی آنکھیں خلا میں
جیسے کچھ تلاش کر رہی تھیں اور رانو کی نظریں زمین میں دھنس جانے کی ناکام
کوشش کر رہی تھیں چند لمحوں کے بعد دل کی بات اس شخص کی زبان پر آہی
گئی۔
گھر میں کون کون ہیں؟
ہم تینوں۔
تینوں؟ کون کون؟______قدرے تجسس سے اس نے پوچھا۔
ماں، میں اور میرا بھائی ______ زمین کو نظروں سے کریدتے ہوئے
رانو نے جواب دیا۔

ہوں______
مایوسی اور تسلی کے ملے جلے انداز میں اس نے آہ بھری۔ داڑھی کھجائی اور
بولا______اور کوئی______کوئی دوسرا______دوسرا کوئی آدمی
آتا ہے گھر کو؟؟

نہیں۔

رات میں؟

نہیں۔

رانو نے محسوس کیا جیسے رات میں سوتے میں چوہا پھونک پھونک کر اس کے تلوے کتر رہا ہے۔

فوراً اس شخص نے ایک سوال اور داغا ——— وہ سوتی کہاں ہے؟

کون؟

تمہاری ماں؟

ہم دونوں کے بیچ۔

جو وہ سننا چاہتا تھا، ویسی کوئی بات ان جوابوں میں نہ پاکر وہ باؤلا سا ہوگیا۔ اس نے ٹھوڑی پکڑ کر رانو کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

تم جھوٹ کہو تو، میرا مرا منہ دیکھو ——— سچ بتاؤ کون آتا ہے؟

رانو نے ٹھوڑی سے اس کا ہاتھ ہٹایا ——— مجھے دیر ہو رہی ہے۔

وہ پلیا کے پشتے سے بغل کی بل کھاتی پگڈنڈی پر اتر کر جھگی کی جانب چل پڑی اور اس کے سینے پر لوٹتا ہوا سانپ چھوڑ گئی۔

سناٹے میں ڈوبی ہوئی رات، تاریک تھی۔ جھگی میں چمنی کی مدھم لو میں ٹاٹ کے پیوندوں پر ماں بیٹی سوئی جاگی سی لیٹی ہوئی تھیں۔ دروازے کی دستک نے دونوں کو چونکا دیا۔ فوراً دونوں اٹھ بیٹھیں۔ دونوں نے محسوس کیا جیسے دستک دروازے پر نہیں ان کے سینے پر ہوئی ہے۔

ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں۔

رانو کی ماں اٹھی، جوڑا باندھا۔ پلو کمر میں ٹھونسا اور دروازے کی جانب بڑھی۔

اسے یقین تھا رات ہوتے ہی شک کا جنون اسے گھر تک لے آئے گا۔ وہ سارا واقعہ رانو کی زبانی سن چکی تھی۔ اس کا حال سن کر اسے اس پر ترس آیا تھا مگر اپنے کردار پر شک اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لیے وہ اس سے زور آزمائی کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ اس نے دروازے کی کنڈی کھولی۔ باہر سے اس نے دروازہ دھکیلا۔ دروازہ کھلتے ہی سانپ کے پھن کی سی تیزی سے نخرے کی بُو نے اس کی ناک کو ڈس لیا۔ وہ بپھر گئی۔ آؤ۔ آؤ۔ آؤ۔ طنزاً اس نے اندر آنے کو کہا۔

دروازے کی خستہ چوکھٹ کے سہارے جھک کر اس نے اندر قدم رکھا۔

کیا دیکھنے آئے ہو یہاں؟ یہی نا کہ یہاں کون آتا ہے؟ کون رہتا ہے یہاں؟ کس کے ساتھ سوتی ہوں میں؟

اس کی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے۔ جنھیں ان دیکھا کرتے ہوئے اس نے اسے بانہہ سے پکڑ کر ایک طرف دھکیلا۔ دو قدم آگے بڑھا۔ چاروں طرف نظریں گھما کر جھگی کا جائزہ لیا۔ تب تک جسم کا توازن ٹھیک کرتے ہوئے وہ اس کے سامنے آکر بولی

یہاں تمھیں کوئی نہیں ملے گا۔ آج رات میں آئے ہو، کل دن میں آکر دیکھ لینا۔ یہاں ایک ہی مرد رہتا ہے۔ ___ میرا بیٹا۔ اسی کے ساتھ سوتی ہوں میں۔

اس نے اس کی ٹھوڑی کو اپنے پنجے میں پکڑا اور دانت پیستے ہوئے کہا ___ حرام زادی۔ بہت اچھل رہی ہے۔ میں تیرا شوہر ہوں۔ تو کس کے ساتھ سوتی ہے۔ یہ دیکھنے میں نہیں آؤں گا تو کون۔ تیرا باپ آئے گا۔

ہاتھ نچاتے ہوئے اس نے بھی نہلے پر دہلا دے مارا ___ ___

آہاہاہا ___ شوہر ہے تو دو سال تک کہاں گیا تھا؟ گھاس چرنے۔ یا اپنی ماں کی گود میں چوچی چوستے بیٹھا تھا۔ جو دو ٹھیت لے کر آئی تھی یہاں تجھے

ڈھونڈنے۔

وہ طیش میں آگیا۔اس نے اسے تھپڑ رسید کر دیا۔

تھپڑ کی چوٹ کراری تھی۔ چوٹ کی آواز نے رانو کے دل میں مرد کے لیے سوئی ہوئی نفرت کو پھر سے جگا دیا۔

رانو کی ماں نے جوابی حملے میں اس کا منہ نوچنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے مگر پھرتی سے اس نے دونوں کلائیوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ دونوں میں کھینچا تانی شروع ہوگئی۔

یاروں کے ساتھ سوکر بہت کمائی ہے۔ اس لیے زبان قینچی کی طرح چلاتی ہے۔

اس نے رانو کی ماں کو زور سے دھکیلا۔وہ چولہے کے پاس جاگری۔ اس کے سر میں چوٹ آئی۔ خون بہنے لگا۔

میں تیرا مرد ہوں۔تیری کمائی میں برابر کا حصہ دار۔

شرم کر ـــــــ شرم کر۔تیرے جسم میں کیڑے پڑیں گے ـــــ

روتے ہوئے اس نے کہا۔

بتا پیسے کہاں رکھے ہیں؟ ـــــــ وہ لات مار کر بولا۔

اتنا کہہ کر وہ لکڑی کی طاق کی جانب بڑھا۔ رانو کی ماں چیل کی سی تیزی سے جھپٹی مگر تب تک پیسوں کا ڈبہ اس کے ہاتھ لگ چکا تھا۔ وہ اس سے جھڑنے گئی تو اس نے اس کے زیر ناف لات ماری۔ وہ کراہتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ اس نے ایک لات اور رسید کر دی۔ وہ چت ہوگئی۔ یہ اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔

ماں کا یہ حال دیکھا تو رانو نے طیش میں آکر سینے پر سوار اس شخص کے پیچھے سے بال کھینچنے شروع کیے۔ تڑپ کر اس نے گھسیٹ کر رانو کو سامنے لیا۔ غصہ سے دیکھا تو اس کے ذہن میں بجلی سی کوندگئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے

اس نے اس سے پہلے کبھی رانو کو ٹھیک سے دیکھا ہی نہ ہو۔ ہاں دو برسوں میں رانوں کا رنگ اور کاٹھی کچھ زیادہ ہی چنک گئے ہیں۔

وہ خیالوں میں ڈوبا ہوا رانو کے جسم کا معائنہ کر رہا تھا کہ رانو نے اس کے ہاتھ کو کاٹ لیا۔ اس نے زور سے دھکا دیا۔ وہ ایک طرف لڑھک گئی۔

اسے کیوں مارتا ہے رے شیطان ــــــ پھولی ہوئی سانس سے ماں بولی۔

اس نے رانو کی ماں کا گلا دبایا ــــــ مجھے تیری کمائی چاہیے۔ تو کسی کے ساتھ بھی سو۔ مجھے میرا حصہ دے دے۔ بس۔ اس کی مضبوط گرفت سے وہ چھٹ نہ سکی۔ اس نے گالیوں کی بوچھار شروع کر دی۔

اور سن۔ ــــ وہ اپنا منہ اس کے قریب لے گیا اور بولا ــــــ میں تیری بیٹی کو بمبئی لے جا رہا ہوں۔ وہاں اس کے اچھے دام ملیں گے۔

رانو کی ماں نے مرد کے منہ پر تھوک دیا۔ موٹی سی گالی دی اور کہا ــــــ کمینے کتے تو ہم دونوں سے دھندا کروانا چاہتا ہے۔

مرد نے آستین سے چہرہ پونچھا۔ بیوی کے گلے پر ہاتھ کی گرفت سخت کرنے لگا۔ بیوی کی آنکھیں درد کی شدت سے پھیلنے لگیں۔

اچانک رانو نے مرد کے سر پر مسالہ پیسنے کا پتھر زور سے دے مارا۔ چوٹ سے وہ ڈگمگایا۔ ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ عورت نے دھکیل کر اسے نیچے گرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

رانو نے جوش میں آ کر پھر ایک بار اس کے زخمی سر پر پتھر مارا ــــ پھر مارا ــــــ پھر مارا ــــــ مارتی ہی چلی گئی۔

OO